مارچ ۲۰۰۵ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

عرض احوال

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حکومت جس ماڈریٹ اسلام کو پاکستان میں متعارف کرانا اور فروغ دینا چاہتی ہے وہ دراصل یہود و نصاریٰ سے ''تصدیق شدہ اور منظور شدہ'' اسلام ہے جو اللہ اور اس کے رسولؐ کی تعلیمات سے یکسر مختلف ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اسلام کے سب سے بڑے دشمن اور ابلیس کے سب سے بڑے ایجنٹ یہود جس ''اسلام'' پر اپنے اطمینان کا اظہار کریں، وہ اور سب کچھ ہوسکتا ہے، حقیقی اسلام ہرگز نہیں ہوسکتا۔

آج کا انسان تضادِ فکری میں مبتلا ہے، وہ ابدی حقائق سے راہِ فرار اختیار کر کے زندگی گزارنا چاہتا ہے۔ وہ کائنات اور حیاتِ انسانی سے متعلق اہم ترین سوالات اور مسائل سے دانستہ طور پر نظریں چرا کر دنیوی مشاغل اور روز و شب کے معمولات کو اپنے لئے زیادہ سے زیادہ پُر لطف بنانے کو ہی مقصدِ حیات قرار دے بیٹھا ہے۔ کائنات کے خالق و مالک کے بارے میں سوچنا اور اپنی اصل منزل یعنی آخرت کی فکر اس کے نزدیک وقت کا ضیاع ہے۔ بقول اقبال ؎

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد اور ہمارے مسلم حکمران بھی اسی تضادِ فکری کا شکار ہیں جس کا مظہر یہ ہے کہ پاکستان میں حکومتی سطح پر اعلان کیا جا رہا ہے کہ ہم ملک میں اقبال کے تصورات کے مطابق اسلامی معاشرہ قائم کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ اقبال شرم و حیاء کے بہت بڑے علمبردار اور عورت کی عصمت و عفت کی حفاظت کے قائل تھے۔ اقبال نے تو مسلمان عورت کو یہ پیغام دیا تھا کہ:

بتولے باش و پنہاں شو ازیں عصر
کہ در آغوش شبیرے بگیری

لیکن ہمارے ہاں مغربی معاشرے کی تقلید میں اشتہاری بل بورڈز اور ہورڈنگز کے ذریعے جس طرح عورت کی تذلیل کی جا رہی ہے اور میڈیا کے ذریعے فحاشی و بے حیائی کو فروغ دیا جا رہا ہے وہ اقبال کے نظریات کے بالکل خلاف ہے۔ مشرف صاحب کا حالیہ بیان کہ جو لوگ

عورتوں کو نیکروں میں کھیلتے دیکھنا پسند نہیں کرتے وہ اپنی آنکھیں بند کر لیں' ڈھٹائی اور جسارت تو ہے ہی' اقبال کے منہ پر بھی طمانچہ مارنے کے مترادف ہے۔ اسی طرح اقبال کا کہنا تھا کہ سود کے بطن سے سوائے فتنے کے کچھ جنم نہیں لے سکتا اور سود انسان کو درندہ بنا دیتا ہے لیکن ہمارے ہاں سودی نظام کو نہ صرف فروغ دیا جا رہا ہے بلکہ موجودہ حکومت نے انسدادِ سود کے ضمن میں عدالتی سطح پر ہونے والی اب تک کی پیش رفت پر خط تنسیخ پھیر دیا ہے۔ اقبال نے مسلمانوں کو درس دیا تھا کہ ''اسلام تیرا دیس ہے تو مصطفویؐ ہے'' لیکن ہم پاکستان کے اسلامی تشخص کو مٹانے کے امریکی دباؤ کے سامنے سجدہ ریز ہیں' جس کا مظہر یہ ہے کہ پوری قوم کا مطالبہ ہے کہ ۱۵ سال سے پاسپورٹ میں شامل مذہب کے خانہ کو ختم نہ کیا جائے لیکن نئے پاسپورٹ میں مذہب کا خانہ شامل نہ کر کے اسلامی تشخص کو مٹانے کی عالمی سازش کی تکمیل کی جا رہی ہے۔ اقبال کے نظریات کی روشنی میں تو ہمارے ہاں شناختی کارڈ میں بھی مذہب کا خانہ شامل ہونا چاہیئے تا کہ معلوم ہو کہ اسلام کے نام پر بننے والے اس ملک کے کسی شخص کا کیا مذہب ہے۔ اسی طرح آغا خان تعلیمی بورڈ کے حوالے سے جو نصاب ہمارے ملک میں متعارف کرایا جا رہا ہے' اس کا مقصد بھی پاکستانی معاشرے کو مغربی تہذیب کا حصہ بنانا ہے جو دراصل اس امریکی ایجنڈے کا حصہ ہے جس کے مطابق ایک طرف طاقت کے ذریعے جہادی قوتوں کو کچلا جا رہا ہے تو دوسری طرف ایسے تعلیمی منصوبوں کا مقصد مسلمان بچوں کے ناپختہ ذہنوں سے شرم وحیا کے پاکیزہ جذبات اور جہادی تصورات کو بچپن ہی سے نکال پھینکنا ہے۔

حافظ عاکف سعید نے کہا کہ کیا ہم ذہنی طور پر نابالغ اور تہذیب وتمدن کے حوالے سے تہی دامن ہو چکے ہیں کہ اغیار کے نظریات اور تہذیب کو گلے لگا رہے ہیں۔ حالانکہ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات اور دنیا کی بہترین تہذیب کا حامل ہے۔ انہوں نے کہا کہ تعلیم کے حوالے سے ملک وملت کی اصل خدمت یہ ہے کہ ہر سطح پر ایک ہی نصاب رائج ہو جو اسلامی تعلیمات اور نظریہ پاکستان کی اساسات پر استوار ہو۔

(امیر تنظیم اسلامی حافظ عاکف سعید کے ۲۵ فروری ۰۵ء کے خطابِ جمعہ کی تلخیص)

تذکرہ و تبصرہ

پاکستان کا موجودہ خلفشار اور اس کا حل

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ

کا ۲۸ جنوری ۲۰۰۵ء کا خطاب جمعہ' مسجد قرآن اکیڈمی' کراچی

نحمدہٗ ونصلی علٰی رَسولہِ الکریم ...... امّا بَعد:

اعوذ باللّٰہ من الشَّیطٰن الرَّجیم ۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿وَلَنُذِيۡقَنَّهُمۡ مِّنَ الۡعَذَابِ الۡاَدۡنٰى دُوۡنَ الۡعَذَابِ الۡاَكۡبَرِ لَعَلَّهُمۡ يَرۡجِعُوۡنَ ۝۲۱﴾ (السجدۃ)

﴿قُلۡ هُوَ الۡقَادِرُ عَلٰٓى اَنۡ يَّبۡعَثَ عَلَيۡكُمۡ عَذَابًا مِّنۡ فَوۡقِكُمۡ اَوۡ مِنۡ تَحۡتِ اَرۡجُلِكُمۡ اَوۡ يَلۡبِسَكُمۡ شِيَعًا وَّيُذِيۡقَ بَعۡضَكُمۡ بَاۡسَ بَعۡضٍ ؕ اُنۡظُرۡ كَيۡفَ نُصَرِّفُ الۡاٰيٰتِ لَعَلَّهُمۡ يَفۡقَهُوۡنَ ۝۶۵﴾ (الانعام)

ادعیہ ماثورہ کے بعد:

معزز حاضرین اور محترم خواتین —— السلام علیکم!

کافی طویل عرصے کے بعد اس مقام پر آپ حضرات سے ملاقات ہو رہی ہے۔ میں نے اب سے ٹھیک ایک سال قبل لاہور میں عید الاضحیٰ کے موقع پر اپنے مختصر خطاب میں یہ بات کہی تھی کہ پاکستان کے خاتمے کی الٹی گنتی شروع ہو چکی ہے۔ حالات جس رخ پر جا رہے ہیں' اگر ہم اس کا اندازہ کر سکیں اور زمینی حقائق کو پیش نظر رکھیں تو محسوس یہ ہوتا ہے کہ ہماری مہلت اب ختم ہو رہی ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی خاص مداخلت ہو جائے تو اس کے امکان کو کبھی بھی رد نہیں کیا جا سکتا۔

قیام پاکستان کے مثبت اور منفی پہلو

میری وہ بات دو بنیادوں پر قائم تھی۔ پاکستان کے قیام' جواز اور بقاء کے دو پہلو ہیں—— ایک مثبت اور ایک منفی۔ منفی پہلو زیادہ قدیم تھا۔ ۱۹۰۶ء سے جبکہ ڈھاکہ میں مسلم لیگ قائم ہوئی تھی' ۱۹۳۰ء تک' جبکہ علامہ اقبال نے الٰہ آباد میں اپنا تاریخی خطبہ ارشاد فرمایا تھا' تحریک مسلم لیگ کوئی عوامی تحریک نہیں تھی۔ یہ صرف خان بہادروں' وڈیروں اور سَروں کی ایک جماعت تھی' بلکہ اسے جماعت کہنا بھی غلط ہے' وہ محض ایک کلب تھا۔ اُس وقت مسلم لیگ کے پیش نظر بات یہ تھی کہ ہندوستان میں ہندو اکثریت میں ہیں اور ان کے اندر ایک انتقامی جذبہ بھی موجود ہے کہ مسلمانوں نے ہم پر ایک ہزار سال حکومت کی ہے—— اگر ہندوستان ایک ملک کی حیثیت سے آزاد ہو جاتا ہے اور اس میں ویسٹ منسٹر ٹائپ ڈیموکریسی آتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم ہمیشہ کے لئے ہندو کے غلام ہو جائیں گے اور ہم سے انتقام بھی لیا جائے گا—— ہماری تہذیب و ثقافت اور تمدن کو ختم کیا جائے گا' معاشی طور پر ہمارا استحصال کیا جائے گا—— بلکہ اس کے آثار موجود تھے کہ ہمیں شدھی کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ اس سے قبل ہندوستان میں شدھی کی تحریک چل چکی تھی۔ چنانچہ اُس وقت تک تحریک پاکستان کے جذبہ کا محرک صرف ہندو کا خوف اور اپنا تحفظ تھا' جو ایک منفی پہلو تھا۔

البتہ ۱۹۳۰ء کے خطبہ میں علامہ اقبال نے اس میں احیائے اسلام کا انجکشن لگایا۔ جیسے کوئی مریض بستر پر پڑا ہو اور اسے گلوکوز کی بوتل لگی ہوئی ہو تو اگر اسے کوئی انجکشن لگانا ہو تو اسی ٹیوب کے اندر لگا دیا جاتا ہے' اسی طرح علامہ اقبال نے تحریک پاکستان میں احیاء اسلام کا انجکشن لگایا۔ انہوں نے خطبہ الٰہ آباد میں کہا کہ ''یہ تقدیر مبرم (destiny) ہے کہ ہندوستان کے شمال مغرب میں ایک آزاد مسلم ریاست قائم ہو گی''۔ گویا یہ تجویز نہیں تھی' پیشین گوئی تھی۔ لیکن اس کے بعد انہوں نے جو بات کہی وہ بہت اہم ہے: ''اگر ایسا ہو گیا تو ہمیں موقع مل جائے گا کہ اسلام کے چہرے پر جو بدنما داغ دھبے عرب ملوکیت کے دور میں آ گئے تھے' انہیں دور کر کے اسلام کی اصل صورت

دنیا کے سامنے پیش کر سکیں‘‘۔ ظاہر ہے کہ اصل اسلام تو حضورﷺ کے دور کا اور خلافت راشدہ کا اسلام تھا۔ جبکہ ایک بنواُمیہ کے دور کا اسلام ہے‘ ایک بنوعباس کے دور کا اسلام ہے۔ پھر ایک ترکوں کے دور کا اسلام ہے‘ ایک مغلوں کا اسلام ہے‘ ایک صفویوں کا اسلام ہے۔ دورِ ملوکیت میں اسلام کے چہرۂ انور پر جو بدنما داغ اور دھبے آ گئے تھے‘ انہیں ہٹا کر اسلام اپنی اصل صورت میں دنیا کے سامنے پیش کرنے کا جذبہ ایک مثبت جذبہ تھا جو علامہ اقبال نے تحریک پاکستان میں inject کیا۔

مزید برآں‘ علامہ اقبال نے قائداعظم کو ہندوستان واپس آنے پر آمادہ کیا جو مایوس ہو کر انگلستان میں جا بیٹھے تھے۔ قائداعظم ہندوستان کی سیاست سے مایوس ہو کر اس سے کنارہ کش ہو گئے تھے اور انہوں نے انگلستان میں جا کر پریکٹس شروع کر دی تھی۔ ۱۹۳۲ء میں علامہ اقبال تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے انگلستان گئے‘ جس میں قائداعظم شریک نہیں تھے‘ اس لئے کہ وہ سیاست سے بالکل دستبردار ہو چکے تھے۔ اسی موقع پر علامہ اقبال نے ان سے ملاقات کی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ملاقات بالکل ایسی ہے جیسے مولانا روم کی شمس تبریز سے ملاقات تھی۔ اس ملاقات میں علامہ نے احیاء اسلام کا انجکشن قائداعظم کو بھی لگایا‘ حالانکہ وہ اس سے پہلے خالص سیکولر ذہن کے آدمی تھے اور دین کے ساتھ انہیں کوئی خاص لگاؤ تھا ہی نہیں۔ پیدائشی طور پر وہ اسماعیلی یعنی آغا خانی تھے‘ بعد میں سرکاری طور پر انہوں نے اثنا عشری مذہب اختیار کر لیا تھا‘ لیکن مذہب سے ان کا کوئی عملی لگاؤ نہیں تھا۔ اس ملاقات میں علامہ اقبال نے قائداعظم کو ہندوستان واپس آ کر تحریک پاکستان کی قیادت پر آمادہ کیا‘ حالانکہ قائداعظم انگلستان میں قیام کے فیصلے پر جازم تھے۔ شیخ محمد اکرام ایک بہت بڑے مصنف ہیں‘ اللہ ان پر رحمتیں نازل کرے۔ انہوں نے آبِ کوثر‘ موجِ کوثر اور رودِ کوثر کے نام سے ہندوستان کی تاریخ پر انتہائی جامع کتابیں لکھی ہیں‘ جن میں ثقافتی‘ سیاسی اور مذہبی‘ تینوں اعتبارات سے مسلمانانِ ہند اور مسلم ہندوستان کی تاریخ اجاگر کی ہے۔ اس وقت وہ آکسفورڈ میں زیر تعلیم تھے۔ انہوں نے قائداعظم سے آ کر ملاقات

کی اور عرض کی کہ آپ ہندوستان چھوڑ کر کیوں آ گئے' وہاں کے مسلمانوں کو آپ کی قیادت کی ضرورت ہے! اس پر محمد علی جناح نے (جو ابھی قائداعظم نہیں تھے) جو کچھ فرمایا وہ ایک تاریخی جملہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہندو ناقابل اصلاح ہے اور مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ ان کا بڑے سے بڑا لیڈر صبح جو بات مجھ سے کرتا ہے' شام کو جا کر گورنر کو یا ڈپٹی کمشنر کو بتا دیتا ہے۔ اب میں ایسی قوم کی قیادت کروں تو کیسے کروں؟ یہ صد فیصد درست بات تھی جو ان کی تیس برس کی محنت کا نتیجہ ظاہر کرتی ہے۔ انہوں نے ہندوستان میں ہندو مسلم مفاہمت کی سرتوڑ کوشش کی تھی' یہاں تک کہ گوکھلے جیسے شخص نے انہیں ''ہندو مسلم اتحاد کا سفیر'' قرار دیا۔ لیکن آخر کار ان پر واضح ہو گیا کہ ہندو ناقابل اصلاح ہے۔

بہرحال علامہ اقبال کا دیا ہوا انجکشن کارگر ہوا۔ محمد علی جناح ہندوستان واپس آئے تو اس کے بعد ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۷ء تک دس برس انہوں نے اسلام کی ''قوّالی'' گائی ہے۔ یہ جو قوّالی کا لفظ میں استعمال کر رہا ہوں' اسے ان کی توہین پر محمول نہ کیجئے گا' یہ لفظ میں نے خود اپنے لئے بھی استعمال کیا ہے۔ میرے بارے میں ایک صحافی نے کہا تھا کہ یہ قرآن کے قوّال ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ بہت اچھا خطاب ہے جو مجھے دیا گیا ہے۔ واقعتاً میں تو قرآن کے مضامین کی تکرار کر رہا ہوں۔

ما ہرچہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم
اِلّا حدیثِ دوست کہ تکرار می کنیم!

قوّالی میں تکرار ہی تو ہوتی ہے نا! میں دروسِ قرآن اور دورۂ ترجمۂ قرآن کی صورت میں قرآن کی تکرار کر رہا ہوں۔ اسی طرح خود علامہ اقبال نے اپنے لئے لفظِ قوّال استعمال کیا ہے۔ یہ روایت مجھے مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے سنائی تھی کہ ایک مرتبہ مولانا محمد علی جوہر لاہور آئے تھے اور علامہ اقبال کے پاس ہی ٹھہرے ہوئے تھے۔ ایک روز انہوں نے علامہ اقبال سے بے تکلفی میں کہا کہ اقبال! تیرے ایک شعر نے مجھے مسلمان کر دیا' مگر تو اب بھی کافر کا کافر ہے! علامہ اقبال نے اس کا بڑا پیارا

جواب دیا کہ مولانا! اگر خود قوّال کو حال آ جائے تو قوّالی کیسے ہو گی؟ قوّال تو دوسروں کو حال میں لانے کے لئے قوّالی کر رہا ہے۔ تو اسی لفظ کے حوالے سے میں قائداعظم کی بات کر رہا ہوں کہ انہوں نے دس برس قوّالی کی ہے کہ اسلام ہمارا دین ہے۔ ہمارے عقائد' ہمارا قانون' ہماری زبان' ہماری تہذیب' ہمارا تمدن اور ہمارے اصول ہندو سے مختلف ہیں۔ ہم اپنے اصولِ حریت واخوت ومساوات کے مطابق ایک معاشرہ قائم کرنا چاہتے ہیں۔ ہندو اور مسلمان ایک قوم کیسے ہو سکتے ہیں؟ ہم ایک الگ خطۂ زمین پاکستان چاہتے ہیں جہاں ہم اسلام کا بول بالا کریں۔ یہ وہ قوّالی تھی جس سے مسلمانانِ ہند پر حال طاری ہو گیا اور انہوں نے دوسرے سارے حقائق نظر انداز کر دیئے۔ ہندو اکثریت کے علاقوں کے مسلمانوں کو صاف نظر آ رہا تھا کہ ہم کبھی پاکستان میں شامل نہیں ہو سکتے' اس کے باوجود انہوں نے تحریک پاکستان کا ساتھ دیا۔ اسے آپ خواہ پاگل پن یا جنون کا نام دے لیں' بہرحال جس طرح قوالی کے اندر لوگوں کو حال آتا ہے اسی طرح پوری قوم کو حال آ گیا' تب یہ پاکستان بنا ہے۔ یہ تحریک پاکستان کا مثبت پہلو تھا' جس کا نتیجہ ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں ظاہر ہوا کہ پورے ہندوستان میں مسلمانانِ ہند کی واحد جماعت مسلم لیگ بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئی۔

اب صورت حال کیا ہے؟ ستاون اٹھاون برس میں ہم اس مثبت پہلو کی نفی کر چکے ہیں۔ اسلام کی طرف یہاں کوئی مثبت پیش رفت نہیں ہوئی' نہ ہی اس کے لئے یہاں کوئی کشش محسوس کی جا رہی ہے۔ دوسری طرف منفی پہلو بھی اب ختم ہو رہا ہے کہ دونوں جانب سے دوستی اور محبت کے راگ الاپے جا رہے ہیں۔ ویسے میں دیکھ کر آیا ہوں کہ ہندوستان میں بھی اب ہندو مسلم دشمنی ختم ہو چکی ہے۔ وہاں پر مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں نے سیکولرازم کو ذہناً وقلباً قبول کر لیا ہے اور مذہب کو انفرادی معاملہ قرار دے دیا ہے۔ چنانچہ وہ جو دشمنی کی فضا تھی جس میں دو تین نسلیں بیت گئیں' وہ اب قصۂ پارینہ بن چکی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جس شے کی نہ منفی بنیاد باقی رہی ہو نہ مثبت' وہ کب تک قائم رہ سکتی ہے! البتہ' جیسے کہ میں نے کہا' اِلّا یہ کہ اللہ کی طرف سے کوئی خصوصی بات ہو

جائے۔تو اس کی امید ہم آخری وقت تک لگائے رہیں گے۔

اس موضوع پر میں نے ایک مفصل خطاب قرآن آڈیٹوریم لاہور میں ۲۹ر فروری ۲۰۰۴ء کو کیا تھا۔ خطاب کا عنوان تھا: ''کیا پاکستان کے خاتمے کی الٹی گنتی شروع ہو چکی ہے؟ اور کیا ابھی نجات کی کوئی راہ کھلی ہے؟'' یہ خطاب پہلے میثاق (خصوصی اشاعت بابت اپریل ۲۰۰۴ء) میں شائع ہوا اور بعد ازاں ''پاکستان کے وجود کو لاحق خطرات و خدشات اور بچاؤ کی تدابیر'' کے عنوان سے کتابچے کی صورت میں شائع کیا گیا۔ اپنے اس خطاب میں مَیں نے کہا تھا کہ اب مجھے پاکستان کے لئے دو تین سال سے زیادہ کی مہلت معلوم نہیں ہوتی۔ اِس وقت میں صدمے کی کیفیت میں یہ بات کہہ رہا ہوں کہ اس تباہی اور بربادی کے آثار اب شروع ہو چکے ہیں۔ اس ایک سال کے اندر اب دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے' آپ سوچ نہیں سکتے۔ تبدیلی چونکہ دن بدن تدریجاً آتی ہے' لہٰذا اس کا فوری احساس نہیں ہوتا۔ وہ تو اگر جائزہ لیں تو پتا چلتا ہے کہ ہم کہاں پہنچ گئے ہیں!

عذابِ الٰہی کا ازلی و ابدی قانون

اس اعتبار سے میں نے آج آغازِ خطاب میں دو آیتیں پڑھی ہیں۔ سورۃ السجدۃ کی آیت ۲۱ میں اللہ تعالیٰ کا ایک ازلی و ابدی قاعدہ اور قانون بیان ہوا ہے کہ:

﴿وَلَنُذِيقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿٢١﴾﴾

''ہم انہیں لازماً مزا چکھائیں گے چھوٹے عذاب کا اُس بڑے عذاب سے پہلے' شاید کہ یہ باز آ جائیں۔''

۱۹۷۱ء میں ہم پر وہ ''عذابِ ادنیٰ'' آیا۔ چنانچہ ہندو کے ہاتھوں بدترین شکست کی صورت میں کلنک کا ٹیکہ ہمارے ماتھے پر لگا' پاکستان دولخت ہوا اور ہم پر ایک قیامت صغریٰ بیت گئی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب کا ایک کوڑا تھا کہ شاید ہم ہوش میں آ جائیں۔ لیکن ہم ہوش میں نہیں آئے' ہمارے طور و اطوار نہیں بدلے' شب و روز کے

انداز نہیں بدلے‘ ہماری سوچ نہیں بدلی۔ اب شاید عذابِ اکبر کے بادل ہمارے سروں پر منڈلا رہے ہیں جس کے نتیجے میں ہم نسیاً منسیّا ہو کر رہ جائیں گے۔

اپنے مذکورہ بالا خطاب (’’پاکستان کے وجود کو لاحق خطرات و خدشات‘‘) میں مَیں نے کہا تھا کہ کسی مملکت یا سلطنت کے ختم ہونے کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ وہ زمین ہی ختم ہو جائے‘ بلکہ اس کے خاتمے کی دو صورتیں ہوتی ہیں ـــــ ایک یہ کہ اس کے حصے بخرے ہو جائیں اور سابق نام باقی ہی نہ رہے۔ جیسے پچھلی صدی میں سلطنت عثمانیہ ختم ہوئی تو اس کے حصے بخرے ہو گئے اور سلطنت عثمانیہ کا نام دنیا میں باقی نہ رہا۔ اسی طرح سوویت یونین کا خاتمہ ہوا تو وہ سرزمین تو ختم نہیں ہوئی بلکہ اس نے مختلف ممالک کی صورت اختیار کر لی۔ اب وہ یونین نہیں رہی۔ اس میں سے چار ترک ممالک اور مشرقی یورپ کے بہت سے ممالک نکل آئے۔ لیکن USSR کہاں ہوتا تھا‘ یہ ڈھونڈنا اب مشکل ہو جائے گا۔ اسی طرح سلطنت عثمانیہ کہاں ہوتی تھی‘ اس کا ڈھونڈنا مشکل ہو جائے گا۔ مملکتوں کے ختم ہونے کی دوسری صورت میں نے یہ بیان کی تھی کہ اس کا نام و نشان تو برقرار رہے‘ لیکن اس کی خود اختیاری ختم ہو جائے اور وہ کسی دوسری بڑی سلطنت و مملکت کے تابع مہمل کی شکل اختیار کر لے۔ گویا سیٹلائٹ یعنی طفیلی ملک بن جائے۔ چنانچہ اگر خدانخواستہ پاکستان کا خاتمہ ہوا تو اس کی ایک صورت تو یہ ہو سکتی ہے کہ اس کے حصے بخرے ہو جائیں اور اس کے مختلف حصے خود مختار ممالک کی حیثیت اختیار کر لیں ـــــ دوسری صورت یہ ہے کہ اس پر بھارت مسلط ہو جائے اور اسے اپنے اندر ضم کر لے‘ جو اُس کی ہمیشہ سے دلی خواہش ہے ـــــ اور تیسری صورت یہ ہے کہ یہ اپنی خود اختیاری سے دستبردار ہو جائے اور نیپال کی طرح بھارت کا تابع مہمل بن کر رہ جائے۔ جیسے نیپال کو دس سے ضرب دے دیں تو وہ پاکستان بن جائے گا۔ بہرحال اب محسوس ہوتا ہے کہ وہ عذابِ اکبر قریب آیا چاہتا ہے۔

عذابِ الٰہی کی تین صورتیں

سورۃ الانعام (آیت ۶۵) میں اللہ تعالیٰ کے عذاب کی تین صورتیں بیان ہوئی

ہیں: ﴿قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ﴾ ''(اے نبیؐ! ان سے) کہہ دیجئے کہ وہ (اللہ) اس پر قادر ہے کہ تم پر کوئی عذاب تمہارے اوپر سے اتارے''۔ کوئی عذاب آسمان سے اتر آئے۔ کوئی بہت بڑا شہاب ثاقب دھماکے کے ساتھ زمین پر آ گرے۔ چاند ہی زمین سے ٹکرا کر اس میں دھنس جائے' جیسے کہ وہ قیامت کے قریب سورج کے اندر دھنسے گا۔ سورۃ القیامۃ میں اس کا بایں الفاظ ذکر ہے: ﴿وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ﴾ ——— چنانچہ ایک تو اوپر سے عذاب آ سکتا ہے۔ ﴿اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ﴾ ''یا تمہارے قدموں کے نیچے سے عذاب آ جائے''۔ قدموں کے نیچے سے عذاب کی ایک علامت آپ نے گزشتہ دنوں ''سونامی'' کی صورت میں دیکھی۔ سورۃ الزلزال میں زلزلۂ قیامت کا نقشہ یوں کھینچا گیا ہے: ﴿اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ۙ وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ۙ وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَالَهَا ۚ﴾ ''جب زمین اپنی پوری شدت سے ہلا ڈالی جائے گی' اور زمین اپنے اندر کے سارے بوجھ نکال کر باہر ڈال دے گی' اور انسان کہے گا کہ یہ اسے کیا ہو رہا ہے؟'' سونامی زلزلے میں سمندر کی کیفیت یہ تھی کہ لوگ کہہ رہے تھے کہ اس سمندر کو کیا ہو گیا ہے؟ تیس چالیس فٹ بلند لہریں آ رہی تھیں' جو ہر چیز کو واش آف کر کے چلی گئیں۔ میں کوئی جیالوجسٹ نہیں ہوں' لیکن اس کی تعبیر میرے نزدیک یہ ہے کہ سمندر کی تہہ میں کوئی بہت بڑی دراڑ پڑی ہے' جس سے سمندر کا پانی جوف الارض کے اندر گیا ہے' پھر جو اندر دہکتی ہوئی آگ ہے اس سے ابل کر دوبارہ اوپر آیا تو خوفناک سمندری طوفان کی صورت بن گئی۔ چنانچہ آپ نے پڑھا ہو گا کہ بعض لوگوں نے جو سمندر کے کنارے کھڑے تھے یہ دیکھا کہ سمندر پیچھے ہٹ رہا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے سمندر میلوں پیچھے چلا گیا۔ لوگ حیران و پریشان تھے کہ سمندر کا پانی کہاں چلا گیا؟ اس لئے کہ پانی قشر ارض سے نیچے چلا گیا تھا اور پھر زمین کے اندر دہکتی ہوئی آگ اور پگھلی ہوئی دھاتوں پر ابلتے ہوئے اور جوش کھاتے ہوئے واپس آیا تو چالیس پچاس فٹ تک بلند لہریں اٹھیں جو ہر شے کو تباہ کر گئیں۔

سمندروں کے ابلنے کا نقشہ قرآن حکیم کی دو جڑواں سورتوں میں کھینچا گیا ہے۔ سورۃ التکویر میں ارشاد ہوا: ﴿وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ۝﴾ ''اور جب سمندر بھڑکا دیئے جائیں گے''۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ برتنوں کو قلعی کرنے والے جب آگ جلاتے تھے تو دھونکنی کے ذریعے سے اس آگ کو بھڑکاتے تھے۔ اسی طرح سنار بھی آگ بھڑکانے کے لئے دھونکنی کا استعمال کرتے تھے۔ تو جس طرح دھونکنی سے آگ بھڑک اٹھتی ہے اسی طرح سمندر بھی بھڑکا دیئے جائیں گے۔ اگلی سورت (سورۃ الانفطار) میں الفاظ آئے ہیں: ﴿وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ۝﴾ ''اور جب سمندر ابل پڑیں گے''۔ سمندروں کا بھڑکایا جانا اور ان کا ابل پڑنا علاماتِ قیامت میں سے ایک علامت ہے جو اُس وقت بڑے پیمانے پر ظاہر ہوگی' لیکن اس کا ایک ہلکا سا نقشہ اللہ تعالیٰ نے دکھا دیا ہے۔

سورۃ الانعام کی مذکورہ بالا آیت کے حوالے سے عذاب کی تیسری صورت یہ ہے: ﴿اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ۭ﴾ ''یا تمہیں آپس میں گروہ در گروہ کر دے اور ایک گروہ کو دوسرے گروہ کی طاقت کا مزا چکھوا دے''۔ اللہ کو نہ اوپر سے عذاب بھیجنے کی تکلیف کرنی پڑے نہ زمین کو پھاڑنا پڑے' بلکہ تمہیں گروہوں میں تقسیم کر کے آپس میں ٹکرا دے کہ ایک دوسرے کے سر پھوڑو اور گردنیں مروڑو۔ اس طرح ایک کی طاقت کا مزا دوسرا چکھے۔

ملکی حالات کا ایک جائزہ

اس پس منظر میں عرض کر رہا ہوں کہ پاکستان پر تباہی کے بادل ہر چہار طرف سے امڈ امڈ کر آ رہے ہیں۔ میں ذرا ملکی حالات کا جائزہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔ بقول علامہ اقبال ؎

''میں اپنی تسبیح روز و شب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ!''

علامہ اقبال نے اختلافِ لیل و نہار کو ایک تسبیح سے تشبیہہ دی ہے جو سیاہ و سفید دانوں پر مشتمل ہے۔ رات اور دن تسبیح کے دانوں کی مانند آگے پیچھے آ رہے ہیں۔ سیاہ دانہ گرتا ہے' پھر سفید دانہ گرتا ہے' پھر سیاہ دانہ آ جاتا ہے' پھر سفید دانہ آتا ہے۔ گویا تسبیح

کے دانے گر رہے ہیں۔ لیکن ان دانوں کو شمار کرنے والے لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔ اکثر لوگ اس کی پروا نہیں کرتے کہ حالات کدھر جا رہے ہیں' اس لئے کہ لوگوں کو اپنے دھندوں ہی سے فرصت نہیں ہوتی۔ اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالنا ہی اتنا بڑا پراجیکٹ ہے کہ کسی اور طرف کیا دھیان دیں! بہرحال میں ملکی حالات کا ایک جائزہ پیش کر رہا ہوں۔

ایک طرف آپ دیکھئے کہ بلوچستان میں اب آتش فشاں پھٹنے کو پوری طرح تیار کھڑا ہے اور کہنے والے کہہ رہے ہیں کہ اب مشرقی پاکستان کی تاریخ بلوچستان کے اندر دہرائی جائے گی۔ آپ چاہیں تو ذرا تاریخی پس منظر بھی دیکھ لیں۔ تقسیم ہند کے وقت اکثر بلوچ سردار پاکستان میں شامل ہونے کے حق میں نہیں تھے' خان قلات نے تو بہت زور لگایا تھا کہ ہم آزاد بلوچستان قائم کریں' ہمارا بہت بڑا علاقہ ہے' پھر ہم سمندر پر بیٹھے ہیں' ہمارے پاس معدنی وسائل بہت زیادہ ہیں جبکہ آبادی بہت کم ہے۔ لیکن اُس وقت انگریز نے جاتے جاتے بھارت کو دو حصوں میں تقسیم تو کیا' اس سے زیادہ حصوں میں تقسیم کرنا اس نے اپنی مصلحت کے خلاف سمجھا۔ لہٰذا بلوچستان پاکستان میں شامل ہوا۔ اس کے بعد سے وہاں مسلسل سرداری نظام قائم ہے۔ سوچنا' سمجھنا' غور کرنا اور رائے بنانا عوام کا کام ہی نہیں ہے' عوام تو کالانعام سمجھے جاتے ہیں' بلکہ اس سے بھی گئے گزرے۔ جیسے قرآن کہتا ہے: ﴿اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلُّ﴾ ''وہ تو چوپایوں کی مانند ہیں' بلکہ ان سے بھی گئے گزرے۔'' سوچ بچار اور غور و فکر کا سارا کام وہاں بلوچ سردار کرتے ہیں۔ بلوچستان میں احساسِ محرومی بہت شدید ہے جو ماضی میں بار بار سر اٹھاتا رہا ہے۔ اسے دبانے کے لئے ہم نے دو مرتبہ ایئر فورس استعمال کی ہے جو پاکستان کے کسی اور خطے میں کبھی استعمال نہیں ہوئی۔ ۱۹۸۳ء میں جب ایم آر ڈی کی تحریک زوروں پر تھی' سندھ کے اندر بھی فوج تو استعمال ہوئی تھی' لیکن اس سے آگے ایئر فورس وغیرہ سے بمباری نہیں ہوئی۔ تو یوں سمجھئے کہ یہ ابتداء ہی سے ایک غیر مطمئن علاقہ ہے۔ اس کے اس عدم اطمینان کو سوویت یونین کی طرف سے بہت بڑی

سپورٹ ملی تھی۔ سوویت یونین کی پالیسی تھی کہ ''قومیتوں کا پرچار کرو اور قوموں کو تقسیم کرو!'' یعنی مسلمان ملکوں کو قومیتوں کی بنیاد پر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے۔ چنانچہ جس طرح عظیم تر کُردستان کی تحریک تھی کہ ایران' عراق اور ترکی کے کُرد اکثریت کے علاقوں پر مشتمل آزاد کردستان بنایا جائے' اسی طرح سوویت یونین کی تائید و نصرت سے بلوچستان نیشنل موومنٹ کے نام سے عظیم تر بلوچستان کی تحریک بڑے زور شور سے چلی۔ وہ تو خود سوویت یونین کا خاتمہ ہو گیا' لہٰذا وہ بات ایک عرصے کے لئے دب گئی۔ ہمیں محسوس ہوا کہ شاید وہ تحریک ختم ہو گئی' لیکن معاملہ وہی تھا کہ ع ''آگ بجھی ہوئی نہ جان' آگ دبی ہوئی سمجھ!'' اس لئے کہ ان میں اپنی محرومی اور خاص طور پر علاقائی خود اختیاری سے محرومی کا احساس مسلسل پروان چڑھتا رہا۔

ہم نے اپنی تاریخ میں صوبوں کو اس قدر مقدس مقام دیا ہے گویا یہ آسمان سے نازل ہوئے ہیں۔ ہمارے ہاں نئی کمشنریاں بن گئیں' ضلعے نئے سے نئے بن گئے' جو تحصیلیں ہوتی تھیں وہ اب ضلعے بن گئے ہیں' لیکن صوبے مزید تقسیم نہیں ہو سکتے' حالانکہ صوبوں کی موجودہ تقسیم نہایت غیر فطری' غیر منطقی اور غیر معقول ہے کہ ایک صوبہ تعدادِ آبادی کے اعتبار سے بقیہ تینوں صوبوں سے زیادہ ہے۔ اب ظاہر بات ہے کہ وہ صوبہ چھوٹے صوبوں کی نظروں میں کھٹکتا ہے۔ صوبہ پنجاب انگریز کے دور ہی میں تعلیم اور سروسز وغیرہ کے اعتبار سے زیادہ ایڈوانس تھا۔ اس کا ایک خاص سبب یہ تھا کہ باقی ہندوستان میں انگریز نے مسلمانوں سے حکومت چھینی تھی جبکہ پنجاب میں انگریزوں نے آ کر مسلمانوں کو سکھا شاہی سے نجات دی تھی۔ اس طرح زمین و آسمان کا فرق واقع ہو گیا۔ سکھا شاہی بدترین حکومت تھی۔ سکھا شاہی کے معنی ہی یہ ہیں کہ کوئی قانون نہیں' کوئی اصول نہیں! لہٰذا پنجاب میں انگریز گویا مسلمانوں کا محسن بن کر آیا۔ اس کے برعکس سندھ میں انگریز نے مسلمانوں سے حکومت لی۔ انگریز نے تالپوروں کی حکومت کا خاتمہ کر کے سندھ پر قبضہ کیا تھا لہٰذا سندھ میں انگریز کے لئے کبھی اچھے جذبات پیدا نہیں ہو سکے۔ بلکہ آزادیٔ ہند تک وہاں پیر پگاڑا کے حُر مجاہدین آمادۂ بغاوت رہے اور

انگریز کے خلاف کارروائیوں میں مصروف رہے۔ کبھی وہ کوئی ریلوے سٹیشن اڑا دیتے' کبھی کوئی ڈاک خانہ لوٹ لیتے۔ انہوں نے انگریزوں کو چین سے نہیں بیٹھنے دیا۔ لیکن پنجاب نے ۱۸۵۷ء میں اپنی مسلمان فوج بھیج کر انگریز کو دہلی کا قبضہ لے کر دیا۔ اس فرق کو پیش نظر رکھئے۔ یہی وجہ ہے کہ انگریز نے پنجاب کو خوب ترقی دی۔ چنانچہ پورے پنجاب میں کالجز کی ایک زنجیر ہے۔۔۔ ایس ای کالج بہاولپور' ایمرسن کالج ملتان' ایف سی کالج لاہور' مرے کالج سیالکوٹ' گورڈن کالج راولپنڈی' اور اس سے آگے ایڈورڈ کالج پشاور۔۔۔ لیکن پورے سندھ میں انگریزوں نے کوئی کالج نہیں بنایا۔ کوئی تعلیمی ادارہ پارسیوں نے بنا لیا' مسلمانوں نے مدرسۃ الاسلام بنا لیا۔ انگریز نے اہل سندھ کو پسماندہ رکھا اور انہیں دبایا۔ انہیں ''نان مارشل ریس'' قرار دے کر فوجی ملازمت کے لئے نااہل قرار دے دیا۔

جب ملک کے اندر ترقی ہوئی تو جو حصہ پہلے سے زیادہ ترقی یافتہ تھا اس نے زیادہ مفادات حاصل کئے۔ یہ فطری سی بات ہے' اس میں کسی کی بدنیتی کو دخل نہیں۔ لیکن اس سے چھوٹے صوبوں میں محرومی کا ایک احساس رہا۔ یہی احساس مشرقی پاکستان میں ہوا جس نے اسے بنگلہ دیش بنایا' ورنہ مسلم لیگ کی تو جنم بھومی ڈھاکہ تھی۔ مسلم لیگ کو بنگال میں بھی پنجاب کی طرح مینڈیٹ ملا تھا۔ وہاں مسلم لیگ کی حکومت ایک طویل عرصے تک رہی' جبکہ یہاں ایک دن کے لئے بھی نہیں بنی۔ تو مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کے ساتھ جتنا گہرا لگاؤ بنگالی مسلمانوں کو تھا اتنا پنجابیوں کو نہیں تھا۔ سرحد میں آخری وقت تک ڈاکٹر خان صاحب کی کانگریس کی حکومت تھی۔ صرف سندھ میں مسلم لیگ کی حکومت تھی۔

بہرحال اس وقت جو حالات ہیں' بہت تشویش ناک ہیں۔ بلوچستان میں صورت حال یہ بن چکی ہے کہ وہ لاوا پوری طرح پک کر اب پھٹ رہا ہے اور اس کے دو محاذ سامنے آئے ہیں۔۔۔ ایک حربی (militant) اور ایک سیاسی (Political)' جیسے کہ اس طرح کے معاملات میں ہمیشہ ہوتا ہے۔ فلسطین میں بھی ایک طرف جنگجو

(militants) تھے اور ایک طرف وہ لوگ جو سیاسی گفت وشنید تک محدود رہتے تھے۔ اِس وقت وہاں militants کی کمر تقریباً ٹوٹ چکی ہے اور انہوں نے گویا ہار مان لی ہے۔ اسی لئے شیرون صاحب خوش ہیں کہ ہاں اب ٹھیک ہو رہا ہے۔ اس لئے کہ جنگجو لوگوں کو تو انہوں نے ایک ایک کر کے ٹارگٹ بنا کر ختم کر دیا۔ شیخ یاسین صاحب جیسے بوڑھے اور معذور شخص کو نہیں چھوڑا تو اور کس کو چھوڑیں گے؟ بلوچستان میں بھی ایک طرف بلوچستان لبریشن آرمی ہے جو militants ہیں اور ایک طرف بلوچ سردار ہیں جو گفت وشنید پر آمادہ ہیں کہ آؤ ہم سے بات کرو۔

اِس وقت بلوچستان میں جو ترقیاتی منصوبے شروع کئے جا رہے ہیں اس سے آگ مزید بھڑک رہی ہے۔ میں نے لاہور میں بھی کہا تھا کہ مشرقی پاکستان میں کتنے صنعتی منصوبے شروع کئے گئے تھے' لیکن کیا اُن کے احساسِ محرومی کے زخم کے اوپر مرہم رکھا جا سکا؟ آج آپ میگا پراجیکٹس کی بات کر رہے ہیں اور یہ کہ اب بلوچستان کے عوام کے لئے خوشحالی آئے گی' جبکہ بلوچستان کے عوام دیکھ رہے ہیں کہ یہ تو باہر سے لوگ آ رہے ہیں۔ گوادر کی زمینیں یہاں بیٹھ کر خریدی جا رہی ہیں' ان کے سودے ہو رہے ہیں اور ان کی قیمتیں بڑھتی چلی جا رہی ہیں۔ گوادر کی سبزی منڈی کے اشتہار تو یہاں لگے ہوئے ہیں۔ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ جب یہ ہو گا تو ہمارا حال کیا ہو گا! ہم تو بالکل اقلیت بن کر رہ جائیں گے۔ تو یہ میگا پراجیکٹس بجائے کوئی مثبت نتائج پیدا کرنے کے منفی نتائج پیدا کر رہے ہیں۔ بلوچوں کے مطالبات میں سے ایک مطالبہ یہ ہے کہ پاکستان کے دوسرے حصوں سے جو لوگ یہاں آ کر آباد ہوں انہیں ووٹ دینے کا حق نہیں ہو گا' اس لئے کہ ہم نہیں چاہتے کہ ہم اپنے ہی صوبے میں اقلیت بن کر رہ جائیں۔

افسوس کہ صدر مشرف صاحب نے اس آگ پر مزید تیل چھڑکا ہے' حالانکہ وہ اب خاصے منجھے ہوئے سیاست دان بن چکے ہیں۔ انہوں نے جس طرح کے الفاظ استعمال کئے کہ ''انہیں پتا بھی نہیں چلے گا کدھر سے ہٹ ہو گئے'' یہ تو کسی ملک کے صدر کی زبان ہی نہیں ہے۔ ایسی گفتگو تو ایک عام سیاست دان کو بھی زیب نہیں دیتی۔ اب

ظاہر بات ہے کہ اس سے ردعمل تو پیدا ہوگا۔ پسماندہ اقوام کی دولت غیرت وحمیت ہی تو ہوتی ہے۔ جو قوم جتنی پسماندہ ہوتی ہے اس میں غیرت وحمیت اتنی ہی زیادہ ہوتی ہے' اور جیسے جیسے ترقی آتی ہے غیرت وحمیت کا جنازہ نکلتا چلا جاتا ہے۔ جیسے جیسے شہروں کی آبادی بڑھتی جاتی ہے' غیرت وحمیت اور بنیادی انسانی اقدار میں کمی آتی جاتی ہے۔ دیہات میں کوئی آدمی کبھی مہمان چلا جائے تو وہ بچھ جائیں گے' اس کی سیوا کریں گے' لیکن ایک شہری آدمی کہاں کسی کی مہمان نوازی کرے گا! بڑے شہروں میں تو ساری بنیادی اخلاقی قدریں ختم ہو جاتی ہیں۔ اسی لئے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حکم دیا تھا کہ کوئی شہر پانچ لاکھ کی آبادی سے بڑھنے نہ دیا جائے۔ جب ایک شہر کی آبادی پانچ لاکھ سے بڑھنے لگے تو ایک اور شہر آباد کیا جائے۔ یہ بات جب علامہ اقبال نے غالباً مسولینی سے کی تھی تو وہ عش عش کر اٹھا تھا۔

بلوچستان کا مسئلہ اب ایک عقدۂ لاینحل (dilemma) کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ اگر حکومت کی طرف سے طاقت استعمال کی جائے تو اس کا منفی ردِّعمل ہوگا اور اگر طاقت استعمال نہ کریں تو اسے پسپائی سمجھا جائے گا۔ ابھی انہوں نے سوئی گیس فیلڈ میں جو تماشا دکھا دیا ہے' یہ اگر ذرا بڑے پیمانے پر ہوتا تو کیا پاکستان میں قیامت صغریٰ نہ آ جاتی؟ سوئی گیس کا سلسلہ منقطع ہو جاتا تو کیا ہمارے گھروں میں چولہے جلتے؟ سرد ترین علاقوں میں پانی کیسے گرم ہوسکتا؟ ایندھن والے چولہے بنانے اور پھر ایندھن جھونکنے کا دور تو اب نہیں رہا۔ اب تو وہ عورتیں ہی نہیں رہیں جو لکڑی کے ایندھن سے دھونک دھونک کر اپنی جان کھپا کر روٹی پکاتی تھیں۔ اب ہمارے کارخانے بھی گیس کے محتاج ہیں' خاص طور پر کھاد فیکٹریوں میں تو سوئی گیس خام مال کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ چنانچہ گیس کی سپلائی بند ہونے سے ہمارے کارخانے بھی بند ہو جائیں گے۔ اس صورت حال میں حکومت خاموش تماشائی تو نہیں بن سکتی' لہٰذا فوج کی پیش قدمی ہو رہی ہے' گیس فیلڈ کا گھیراؤ ہو گیا ہے' لیکن اس کے باوجود وہاں تخریبی کارروائیاں ہو رہی ہیں۔ کہیں ریل کی پٹڑی اکھاڑ دی جاتی ہے' کہیں بم دھماکہ ہو جاتا ہے' کہیں میزائل

داغ دیا جاتا ہے۔ دنیا میں تخریب کاری کے جو بھی انداز ہیں وہ سب کے سب اختیار ہو رہے ہیں۔ پھر یہ بھی نظر آ رہا ہے کہ اس کے پیچھے بین الاقوامی قوتیں ہیں۔ روزنامہ جنگ کے ایک کالم نگار حامد میر نے اپنے کالم ''قلم کمان'' میں لکھا ہے کہ ایک بلوچ نوجوان ان کے پاس روتا ہوا آیا اور کہنے لگا کہ آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ کس قدر تباہی آنے والی ہے۔ آپ میری بات سنیں! پھر اس نے بتایا کہ میں بلوچ ہوں' کوئٹہ میں رہتا تھا' میں بے کار تھا' مجھے کہا گیا کہ آؤ تمہیں اعلیٰ سے اعلیٰ کام دلاتے ہیں۔ وہ مجھے دوبئ لے گئے' جہاں میرا نیا افغان پاسپورٹ بن گیا۔ پھر ہم بنکاک گئے۔ مجھے جس جگہ لے جایا گیا وہاں بہت سے اور نوجوان بھی تھے۔ وہاں ایک تربیت گاہ چل رہی تھی اور ابوالمعالی سید کی کتاب ''پاکستان کے جڑواں ادوار'' (The Twin Eras of Pakistan) سبقاً سبقاً پڑھائی جا رہی تھی۔

میں اس کتاب کا تذکرہ یہاں کئی سال سے کر رہا ہوں۔ ابوالمعالی سید کی پیدائش بہار (انڈیا) کی ہے اور وہ عین تقسیم ہند کے وقت پیدا ہوئے تھے۔ پہلے والدین کے ساتھ مشرقی پاکستان گئے' پھر مغربی پاکستان آ گئے اور یہاں انہوں نے اپنی تعلیم مکمل کی۔ اس کے بعد انہوں نے امریکہ اور یورپ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ وہ کئی پی ایچ ڈیز ہیں۔ مذکورہ بالا کتاب انہوں نے ۱۹۹۲ء میں لکھی تھی اور میں اُس وقت سے اس کا تذکرہ کر رہا ہوں۔ اس میں انہوں نے لکھا تھا کہ ۲۰۰۶ء میں پاکستان کے آٹھ ٹکڑے ہو جائیں گے اور ان میں سے متمدن ترین' ترقی یافتہ ترین اور خوشحال ترین علاقہ آزاد بلوچستان ہوگا۔ اس کے آثار اب نظر آ رہے ہیں۔ میگا پراجیکٹس پر کام ہو رہا ہے اور سرمایہ بڑی تیزی سے وہاں پر منتقل ہو رہا ہے۔ اس کے بعد اگر بلوچستان کی علیحدگی ہو گئی تو یہی ان کا ابتدائی سرمایہ (Starting Capital) ہوگا۔ یہ سب تیاریاں ایک بین الاقوامی سازش کے تحت ہو رہی ہیں۔ اس کے اندرونی عوامل بھی ہیں' اور ظاہر ہے بین الاقوامی سازش ہمیشہ کسی نہ کسی اندرونی فیکٹر ہی کے اوپر اپنی تعمیر کرتی ہے۔ وہ کسی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھے گی' اس کو پکڑے گی اور اس سے آگے بات چلائے

گی۔ کسی ملک میں جا کر خود کوئی نیا مسئلہ پیدا کر دینا آسان کام نہیں ہوتا' لہٰذا پہلے سے پیدا شدہ مسائل کو بنیاد بنایا جاتا ہے۔ اگر کہیں شیعہ مسلم منافرت ہے تو اسے استعمال کر لیا جائے گا۔ اسی طرح اگر کسی علاقے کے اندر عدم اطمینان اور بے چینی ہے تو اس سے فائدہ اٹھایا جائے گا۔

بلوچستان کے بارے میں تو یہ سب کو معلوم ہے کہ یہاں معدنیات کا سب سے بڑا خزانہ موجود ہے' یہاں وسائل کی کوئی کمی نہیں ہے اور اب اسے سنگاپور یا ہانگ کانگ بنایا جا رہا ہے' بلکہ ہو سکتا ہے یہ دوبئ کے مقابلے میں کھڑا ہو جائے۔ دوبئ میں کبھی سوائے ریت کے اور کیا تھا؟ آج وہ کہاں سے کہاں پہنچا ہوا ہے! آج امریکہ کا کوئی شہر اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ سیون سٹار ہوٹل جو دوبئ میں ہے' وہ پوری دنیا میں کہیں نہیں ہے۔ کئی سو ڈالر تو محض اس کے داخلے کی فیس ہے۔ آپ جا کر وہاں چاہے کچھ بھی نہ کھائیں پئیں' صرف اس کی سیر کرنی ہے تو شاید ڈھائی سو ڈالر فیس ہے۔ ہاں اگر آپ چاہیں تو وہ ڈھائی سو ڈالر وہاں پر کھانے پینے میں صرف کر سکتے ہیں۔ بہر حال اب صورت حال یہ ہے کہ بلوچستان میں اگر علیحدگی پسندوں کے خلاف طاقت استعمال نہیں کی جاتی تو وہ سکیم گویا بڑے آرام سے ریڈ کارپٹ پر چلتی ہوئی کامیاب ہو جائے گی۔ اور اگر طاقت استعمال کرتے ہیں تو ردعمل ہوگا' جسے دبانے کے لئے مزید طاقت استعمال کرنی پڑے گی—— اور اس کا وہی نتیجہ نکل سکتا ہے جو مشرقی پاکستان میں طاقت کے استعمال سے نکلا تھا۔ چنانچہ جتنے بھی مذاکرات ہو رہے ہیں' سب ناکام ہو رہے ہیں۔ عطاء اللہ مینگل اور خیر بخش مری سمیت سب نے کہہ دیا ہے کہ اکبر بگٹی سے بات کرو۔ اور بگٹی صاحب کے جو بھی انداز ہیں وہ آپ کے سامنے آ رہے ہیں۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ ہم گولی کی نوک پر بات کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ گویا کہ پاکستان کی مرکزی حکومت کو گولی کی نوک پر سرنڈر کرنا چاہئے۔ گولی تو پہلے آپ نے استعمال کی نا! سوئی گیس فیلڈ کی تنصیبات آپ نے اڑائیں۔ یہاں صرف گولی نہیں' راکٹوں کا استعمال ہوا۔ ٹھیک ہے آپ کہہ دیں گے کہ ہمارا اس تخریب کاری سے کوئی تعلق نہیں ہے' کچھ

لوگ ہوں گے جو یہ کام کر رہے ہیں۔ لیکن کون نہیں جانتا کہ یہ تو ایک ہی شے کے دو محاذ ہوتے ہیں—— ایک سیاسی محاذ ہوتا ہے اور ایک حربی (militant) محاذ ہوتا ہے۔ اندر سے تو سب ایک ہوتے ہیں۔ تو اس کا نام ہے عقدۂ لاینحل (dilemma) جس کا کوئی حل نہیں۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ مشرف صاحب نے اس ضمن میں جو جملے کہے ہیں وہ بہت غلط کہے ہیں۔ اور میں صرف مشرف صاحب کو دوش نہیں دیتا' دراصل یہ ہمارے نظام کی خرابی ہے اور ہماری تمام حکومتوں نے' خواہ وہ سیاسی ہوں' اس نظام کا تحفظ کیا ہے۔ صوبائی مختاری کا مطالبہ سندھی نیشنلسٹ بھی کرتے ہیں اور بلوچی نیشنلسٹ بھی' سرائیکی علاقے والے بھی سرائیکی صوبے کا مطالبہ کرتے ہیں—— لیکن آپ ٹس سے مس ہونے کو تیار نہیں۔ حالانکہ آپ کے پاس یہ کوئی آسمان سے لکھا ہوا تو نہیں آیا کہ یہ صوبے جو ہیں ان کو اسی طرح برقرار بھی رکھنا ہے' ان کو تقسیم بھی نہیں کرنا ہے اور ان کو کوئی اختیارات بھی نہیں دینے۔ آپ امریکہ کی مثال لیجئے کہ وہاں سٹیٹس (states) کے پاس کتنے اختیارات ہوتے ہیں۔ ٹیکسیشن کا نظام ہر سٹیٹ کا اپنا اپنا ہے۔ ایک سٹیٹ میں سگریٹ پر ٹیکس ہے' دوسری میں نہیں ہے۔ لہٰذا لوگ وہاں سے جا کر سگریٹ لے آتے ہیں کہ وہاں سستا مل جاتا ہے۔ ہر سٹیٹ پٹرول کے اوپر ڈیوٹی لگاتی ہے جو اس کی اپنی ہوتی ہے۔ وہ جب چاہے اسے کم کرے یا زیادہ کرے' یہ سٹیٹ کے اختیار میں ہے' لیکن ہم صوبوں کو اس طرح کے اختیارات دینے کو تیار نہیں۔ چنانچہ چھوٹے صوبوں کے عدم اطمینان میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ سردار شیر باز مزاری ہمارے سیاست دانوں میں سے نسبتاً شریف اور دھیمے مزاج کے حامل ہیں اور ان کے دامن پر کوئی نمایاں دھبہ بھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ بلوچستان کی صورت حال پر ان کا بیان آیا ہے کہ یہ مسئلہ مذاکرات سے حل ہونے والا نہیں' بلکہ اس مسئلہ کا کوئی فوری حل ممکن نہیں ہے۔ انہوں نے تو کہا ہے کہ فوری حل ممکن نہیں ہے' میرے نزدیک اس کا حل ممکن ہی نہیں ہے۔ اُدھر کھائی ہے اور اِدھر کنواں ہے' کہاں جائیں گے ہم؟

اب اس سے ذرا اوپر چلئے۔ بلوچستان سے قریباً ملحق وزیرستان کا علاقہ ہے۔ بلوچستان کے اصل میں دو حصے ہیں۔ افغانستان کی سرحد کے ساتھ ساتھ بلوچستان کی پختون پٹی ہے جہاں پٹھان آباد ہیں۔ یہ پختون پٹی صوبہ سرحد کے قبائلی علاقے کے ساتھ مل جاتی ہے اور ساؤتھ وزیرستان اور نارتھ وزیرستان سے جڑتی ہوئی جاتی ہے۔ وزیرستان میں جو کچھ ہو رہا ہے' آپ کے سامنے ہے۔ غیر ملکی لوگ وہاں کتنے ہوں گے؟ اور کتنے عرصے سے وہاں فوج کشی ہو رہی ہے۔ اس طرح مسئلہ تو حل نہیں ہو رہا' بلکہ وہاں نفرت کے بیج بوئے جا رہے ہیں۔ میں پھر کہوں گا کہ جو پسماندہ لوگ ہوتے ہیں ان میں غیرت و حمیت اور انتقام کا جذبہ بہت شدید ہوتا ہے۔ آپ ان کے مہمانوں کو قتل کر رہے ہیں' انہوں نے انہیں پناہ دی تھی' اور یہ وہ ہیں جو آپ کے بھی محسن تھے' بلکہ امریکہ کے بھی محسن تھے۔ وہ یہاں روسیوں سے لڑنے کے لئے آئے تھے' آپ اسلامی جہاد کے نام پر انہیں کھینچ کھینچ کر یہاں لائے تھے۔ یہ اسامہ بن لادن' عمر عبدالرحمٰن اور عبداللہ عزام کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے آئے تھے۔ انہیں کہا گیا تھا کہ یہاں جہاد فی سبیل اللہ ہو رہا ہے۔ لیکن آج آپ امریکہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے انہیں مار رہے ہیں اور پکڑ پکڑ کر امریکہ کے حوالے کر رہے ہیں۔ تو کیا انسانی فطرت اس کو قبول کرتی ہے؟ یہ بات نوٹ کر لیجئے کہ جو تمدن سے جتنا دور ہوتا ہے وہ اتنا ہی فطرت کے قریب ہوتا ہے۔ بقول اقبال ؎

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی
یا بندۂ صحرائی یا مردِ کہستانی!

میدانوں میں رہنے والے نرم و نازک اور عیش پسند ہو جاتے ہیں' ان میں نہ غیرت رہتی ہے نہ حمیت رہتی ہے۔ بڑے بڑے شہروں میں آباد ہونے والے تو عیش و آرام کی زندگی گزار رہے ہیں' لیکن پہاڑوں پر رہنے والوں کو دور دراز سے پانی لانا پڑتا ہے۔ ان کی عورتیں نیچے جا کر وادی کی گہرائیوں میں سے پانی کا مٹکا یا برتن بھر کر سروں پر اٹھاتی ہیں اور مسلسل چڑھائی چڑھ کر گھروں میں پانی لاتی ہیں۔ یہاں ہم سوئچ آن

کرتے ہیں تو روشنی ہو جاتی ہے۔ ان آسائشوں میں رہنے والے وزیرستان کے باشندوں کی مشکلات کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ وہ بھی پاکستان کا ایک ٹائم بم ہے۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ کب پھٹے گا' لیکن جب پھٹے گا تو نہایت خوفناک ہوگا۔

ذرا مزید اوپر چلیں تو یہ قبائلی پٹی شمالی علاقہ جات کے ساتھ ملتی ہے۔ گزشتہ دنوں سکردو اور خپلو میں جو کچھ ہوا ہے وہ ایک لمحہ فکریہ ہے۔ گلگت میں تو پہلے بھی شیعہ سنی فساد ہوتا تھا' لیکن خپلو اور سکردو میں تو کبھی بھی نہیں ہوا۔ میں نے ایک دور میں اس علاقے کے دو تین دورے کئے تھے جب آتش جوان تھا۔ یہ علاقے بالکل ہندوستان کی سرحد کے ساتھ ہیں۔ خپلو سے کچھ آگے ''اسلام چوکی'' ہے جو پاکستانی فوج کی آخری چوکی ہے۔ اس سے آگے جو بارڈر ہے وہ marked ہے ہی نہیں' وہاں گلیشیئرز پڑے ہوئے ہیں۔ میں اسلام چوکی تک ہو کر آیا تھا۔ اس علاقے میں اب فسادات ہوئے ہیں اور کئی روز تک کرفیو لگا رہا ہے۔

بلوچستان' وزیرستان اور شمالی علاقہ جات کے بعد اب ذرا نیچے اتریئے تو کشمیر ہے۔ (یہ تمام علاقے ایک کمان کی شکل میں واقع ہوئے ہیں۔) کشمیر میں بھارت دریائے چناب پر بگلیہار ڈیم بنا رہا ہے اور اس مسئلہ پر اس کے ساتھ مذاکرات ناکام ہو گئے ہیں۔ بھارت اپنے مقام پر ڈٹا کھڑا ہے اور آپ بھاگ کر ورلڈ بینک کے پاس گئے ہیں۔ انہوں نے بھی کہہ دیا ہے کہ ہمارے پاس فائنل اختیار تو نہیں ہے' البتہ ہم غیر جانب دار ماہرین مقرر کر دیں گے۔ لیکن میرے نزدیک بھارت کے پاس سب سے بڑی دلیل یہ ہوگی کہ پاکستان کا مطالبہ زائد المیعاد ہو چکا ہے' ہم یہ ڈیم کئی سال سے بنا رہے ہیں' اس پر انہوں نے پہلے اعتراض کیوں نہیں کیا؟ کیا انہیں اب ہوش آیا ہے؟ اس پر ہمارا زر کثیر صرف ہو چکا ہے' اب ہم اس سے پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں! اور نہ ہی دنیا کی کوئی طاقت انہیں اس پر مجبور کر سکتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ پنجاب کی زمینیں بنجر ہو جائیں گی۔ پنجاب کا سب سے بڑا دریا چناب ہے۔ راوی تو محض ندی ہے۔ اس کو تو پکارتے بھی مؤنث ہیں۔ پنجابی کا پرانا گانا ہے ''وگ دی راوی چناں!'' یعنی راوی چل رہی

ہے۔ جبکہ چناب ایک مردانہ نام ہے۔ جہلم بھی آ کر چناب میں ملتا ہے تو پھر اسے جہلم نہیں کہتے' چناب کہتے ہیں۔ پھر جب راوی بھی آ کر مل جاتا ہے تب وہ بھی چناب کہلاتا ہے۔ یعنی تین دریاؤں کا مجموعہ چناب کہلاتا ہے۔ اس چناب کا انہوں نے اگر یہ حشر کیا تو ہمارے پاس کیا رہ جائے گا؟ دوسری طرف ہمارے شیر صدر مشرف نے وردی برقرار رکھنے کا فیصلہ دیتے ہوئے جو تقریر کی تھی اس میں کہا تھا کہ میں چند ہی دن میں قوم کو ڈیم کی خوشخبری سناؤں گا۔ اب معلوم نہیں وہ چند دن کتنے لمبے ہوتے ہیں۔ وہ مارشل لاء کے نوے دنوں کی طرح کھنچتے چلے جائیں گے اور ڈیم نہیں بن سکے گا۔

یہ بھی نوٹ کر لیجئے کہ مسئلہ کشمیر کے حل کے ضمن میں جو بھی امیدیں دلائی جا رہی تھیں' سب خاک میں مل چکی ہیں۔ بھارت آج بھی یہی بات کہہ رہا ہے کہ وہ تو ہمارا اٹوٹ انگ ہے۔ مذاکرات ہوتے رہیں تو کیا فرق پڑتا ہے۔ دو چار آدمی آئیں گے' چند دن یہاں ٹھہریں گے' باتیں کریں گے اور چلے جائیں گے۔ پھر کچھ دوسرے آ جائیں گے۔ آپ اپنی پبلک کو مطمئن کیجئے کہ مذاکرات ہو رہے ہیں۔ نتیجہ اس کا کچھ بھی نہیں نکلے گا۔ اب بھارت کی طرف سے پہلی مرتبہ یہ بات آئی ہے کہ کشمیر ہمارے سیکولرازم کی نشانی ہے۔ میں ابھی بھارت کا دورہ کر کے آیا ہوں اور میں دیکھ کر آ رہا ہوں کہ اب وہاں سیکولرازم کا راج ہے۔ اب ہندو قوم پرستی اور ہندو انتہا پسندی کا دور چلا گیا۔ اس کی بس ایک لہر آئی تھی اور وہ اب ختم ہو رہی ہے۔ اب وہاں سیکولرازم کو مسلمان بھی ذہناً قبول کر چکے ہیں اور ہندو بھی۔ ان کا کہنا ہے کہ مذہب ہر شخص کا ذاتی معاملہ ہے۔ گھر میں کوئی آدمی کیا کرتا ہے' مسجد میں جا کر کیا کرتا ہے' یہ اس کا انفرادی معاملہ ہے۔ ہمیں اپنے مالی معاملات' اپنے انتظامی معاملات اور اپنے جمہوری حقوق پر توجہ دینی چاہئے۔ چنانچہ اگر وہ مذہب کی بنیاد پر ایک خطۂ زمین الگ کر دیں تو یہ سیکولرازم کے منافی ہو گا۔ کشمیر تو بہت بڑی جگہ ہے' یہ تو ہارٹ آف ایشیا ہے' اس کو وہ کیسے چھوڑ سکتے ہیں؟ بھارت تو آسام سے آگے جو چھوٹی چھوٹی ریاستیں ہیں ان کو چھوڑنے کو تیار نہیں۔

ہمارے ہاں کچھ لوگ جمہوریت کا راگ بہت زیادہ الاپتے ہیں۔ میں خود بھی جمہوریت کا قائل رہا ہوں۔ میرے نزدیک پاکستان کی بقاء اور استحکام کا ضامن تو اسلامی انقلاب ہے' لیکن جب تک وہ انقلاب نہیں آتا یہاں جمہوریت ہونی چاہئے' ورنہ چھوٹے صوبوں کے اندر احساسِ محرومی زیادہ ہو جاتا ہے۔ اگر انہیں جمہوری حقوق حاصل ہوں اور وہ اپنے مطالبات کے لئے جلسے کریں' جلوس نکالیں تو اس طرح اندر کا غبار نکل جاتا ہے' بھڑاس نکل جاتی ہے۔ ورنہ وہ معاملہ اندر ہی اندر دم پخت ہو جاتا ہے اور پھر پھٹ پڑتا ہے۔ ۱۹۴۶ء کے الیکشن کے نتیجے میں جمہوریت کے بطن سے ہی پاکستان کی ولادت ہوئی تھی۔ البتہ اس الیکشن میں جو ووٹ ڈالے گئے تھے وہ اسلام کے نام پر ڈالے گئے تھے۔ چنانچہ میں کہا کرتا ہوں کہ پاکستان کا باپ اسلام ہے اور ماں جمہوریت ہے۔ یہ ہمیشہ سے میرا موقف رہا ہے۔ لیکن بحالات موجودہ غور کیا جائے تو ہماری اصل بیماری یہ ہے کہ ہم ایک قوم نہیں رہے۔ تحریک پاکستان میں اسلام اور مسلمان قوم کی جو قوالی کی گئی تھی اس سے ہماری سب نسلی اور لسانی عصبیتیں دب کر رہ گئی تھیں' جبکہ صوبائی عصبیت اُس وقت تھی ہی نہیں۔ اس قوالی کے نتیجے میں ہم نے ۱۹۴۶ء کے الیکشن میں حال کھیلا اور پاکستان بن گیا۔ اگر قیام پاکستان کے بعد بھی آپ وہ راگ الاپتے رہتے اور آپ نے اسلام کی طرف پیش رفت کی ہوتی تو وہ قوم متحد رہتی' اس کے جذبات ایک جگہ مرتکز رہتے اور اس کے سامنے ایک روشن مقصد زندگی ہوتا۔ ظاہر ہے کہ کسی بلند تر مقصد کے لئے ہی انسان اپنے چھوٹے چھوٹے مفادات کی قربانی دیتا ہے۔ لیکن جب کوئی واضح مقصد ہی سامنے نہیں تو پھر اپنے مفادات اور اپنی مصلحتیں ہی تو رہ جائیں گی—— اور پھر ان میں ٹکراؤ ناگزیر ہے۔ یہ وہ اصل بات ہے جس کی طرف سوچنے کو کوئی تیار نہیں۔ ہمارے کچھ دانشور لکھ رہے ہیں کہ قومی سوچ کو بروئے کار لانا چاہئے۔ یہ حضرات مخلص ہیں اور میں ان کا احترام کرتا ہوں' لیکن میں ان سے پوچھتا ہوں کہ بھئی وہ قوم ہے کہاں؟ جب قوم ہی باقی نہیں رہی تو قومی سوچ کہاں سے آئے گی! سرسید احمد خان کے زمانے میں جب مسلمان قومیت کی کچھ بات شروع

ہوئی تھی تو اکبرالٰہ آبادی نے ایک جلسے پر بڑی زوردار پھبتی چست کی تھی ؎

دیکھ آئے قوم سنتے تھے جسے
چند لڑکے ہیں مشن اسکول کے!

اور اب تو وہ قوم بھی ناپید ہے۔ اب تو قومیتوں کا دور ہے۔ آپ کی قوم قومیتوں کے اندر تحلیل ہو چکی اور وہ قومی اور صوبائی عصبیتیں بہت مضبوط ہیں۔ قومی دانش کہاں سے آئے گی جبکہ قوم ہی کوئی نہیں!

کچھ علاج اس کا بھی اے چارہ گراں.....؟

اب میں اپنی گفتگو کے آخری حصے پر آتا ہوں کہ اس صورت حال کا کوئی علاج بھی ہے یا نہیں! جیسا کہ میں نے عرض کیا' میں بھی قوّال ہوں اور ایک عرصے سے توبہ کی قوالی یا بالفاظ دیگر توبہ کی منادی کر رہا ہوں۔ توبہ کی منادی حضرت عزیر علیہ السلام نے کی تھی' جس سے یہود کے اندر از سرِ نو جان پیدا ہوئی' لیکن یہاں تو ''زمیں جنبد نہ جنبد گل محمدؐ'' والا معاملہ ہے۔ اقبال نے کہا تھا ع ''یہی ہے مرنے والی امتوں کا عالمِ پیری!'' میں اپنے دل پر پتھر رکھ کر یہ شعر سنا رہا ہوں ؎

اس کی بربادی پہ آج آمادہ ہے وہ کارساز
جس نے اس کا نام رکھا تھا جہانِ کاف و نوں!

پاکستان کا قیام اللہ کی ایک خاص حکمت عملی تھی۔ ہم خود ناکام ہوئے اور ہم نے اللہ کی مشیت سے بھی بغاوت کی! گویا ہم ایک ناکام ریاست ہیں (We are a failed state)۔ کیا سٹیٹ صرف پیسوں سے ہوتی ہے؟ اگر آپ کے زرمبادلہ کے ذخائر دس بارہ ارب ڈالر ہو جاتے ہیں تو قوم کامیاب ہے' ورنہ ناکام ہے؟ میں کہتا ہوں کہ وہ قوم کہاں ہے؟ اور اس قوم کے پیش نظر جو مقصد تھا وہ کہاں ہے؟ پروفیسر زائرنگ ایک امریکی تھے' جو سٹاف کالج لاہور میں بہت عرصے تک پڑھاتے رہے۔ امریکہ واپس جا کر انہوں نے ایک کتاب لکھی تھی جس کا ایک جملہ میرے دل میں تیر کی طرح پیوست ہو گیا۔ وہ جملہ یہ تھا: ''Pakistan is still in search of an identity''

یعنی پاکستان ابھی تک اپنے تشخص کی تلاش میں ہے کہ میں ہوں کون؟ کہاں سے آیا ہوں؟ کیوں آیا ہوں؟ اور آج اس ملک میں آپ کو کوئی دانشور ایسا نہیں ملے گا جو یہ نہ کہہ رہا ہو کہ پاکستان کا قیام غلط تھا۔ آپ کی نوجوان تعلیم یافتہ نسل آج آپ سے سوال کرتی ہے کہ پاکستان کس لئے بنا تھا؟ ان کے سامنے اس کا کوئی جواز ہی نہیں آتا۔ وہ ہندوستان جاتے ہیں تو یہی ماحول وہاں دیکھتے ہیں۔ وہی بینکنگ وہاں ہے' وہی یہاں ہے۔ وہی ملٹی نیشنل کمپنیاں وہاں آ گئی ہیں جو یہاں آئی ہیں۔ وہی میکڈونلڈ وہاں بھی آ گیا ہے' یہاں بھی آ گیا ہے۔ تو فرق کیا ہے؟ مسجدیں وہاں بھی ہیں' یہاں بھی ہیں۔ وہ تو چند تاریخی مسجدیں ہیں جن کے بارے میں انہوں نے تنازعہ اٹھایا ہے اور ان میں سے بھی صرف ایک ہی کو مسمار کر سکے ہیں۔ لیکن اسی سے وہاں کے مسلمانوں کے اندر جان پڑ گئی ہے' وہ زندہ ہو گئے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں پہلی مرتبہ ۱۹۷۱ء میں سانحہ مشرقی پاکستان نے زندگی عطا کی تھی۔ اس سے پہلے ہم سمجھتے تھے کہ پاکستان ہمارا محافظ ہے' لیکن ۱۹۷۱ء میں پاکستان کی شکست و ریخت کے بعد ہم نے سوچا کہ پاکستان اپنی حفاظت ہی کر لے تو بہت بڑی بات ہے' یہ ہماری حفاظت کیسے کرے گا؟ ہمیں تو یہاں رہنا ہے' لہٰذا اب ہم نے بھیڑوں بکریوں کی طرح نہیں مرنا' بلکہ مار کر مرنا ہے۔ چنانچہ ہندوستانی مسلمانوں میں ایک ہمت پیدا ہوئی۔ پھر جب ۱۹۹۲ء میں ایودھیا کی بابری مسجد گرائی گئی تو ہندوستانی مسلمانوں میں مزید ہمت پیدا ہو گئی' اور وہاں کا مسلمان ڈٹ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی تعلیمی ترقی اور صنعت و تجارت پر خصوصی توجہ دی۔ میں گزشتہ دنوں بھارت کا دورہ کر کے آیا ہوں۔ ۳۳ دن وہاں رہا ہوں۔ شمالی ہند میں دہلی اور علی گڑھ جبکہ جنوبی ہند میں ممبئی' پونا' بنگلور اور حیدر آباد دکن کا تفصیلی دورہ کیا۔ واپس آ کر میں وہاں کے حالات پر ایک مفصل تقریر میں اپنے مشاہدات و تاثرات بیان کر چکا ہوں۔ (یہ تقریر میثاق فروری ۲۰۰۵ء میں شائع ہو چکی ہے۔)

جہاں تک توبہ کی منادی اور توبہ کی تکرار (یا توبہ کی قوالی) کا تعلق ہے' یہ میں کم از

E:\Ms-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq march05\ms17-02.inp 8/22/2014 4:07 PM PAGE 12 (1,1)

کم گزشتہ پندرہ سال سے کر رہا ہوں کہ ہمیں انفرادی توبہ بھی کرنی چاہئے اور اجتماعی توبہ بھی! ——— طے کریں کہ اگر انفرادی زندگی‘ عائلی زندگی اور گھریلو زندگی میں کوئی شے خلافِ اسلام ہے تو اسے ترک کرنا ہے۔ ورنہ توبہ کی تسبیحیں پڑھنے سے توبہ نہیں ہوتی‘ ذکر کا ثواب ضرور حاصل ہو جائے گا۔ آپ ہزار دانے کی تسبیح لے کر ایک ایک دانے پر پڑھتے جایئے: ”اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَـیْہِ“ اس سے ذکر کا ثواب تو حاصل ہو جائے گا‘ توبہ نہیں ہو گی۔ توبہ کی شرط لازم یہ ہے کہ آپ جس گناہ میں مبتلا ہیں‘ پہلے اس کو ترک کیجئے۔ آپ کی توبہ کا کوئی فوری نتیجہ خواہ سامنے نہ آئے‘ آپ توبہ کر کے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگیں گے تو وہ آپ کی دعا سنے گا‘ ورنہ آپ کی دعائیں آپ کے منہ پر دے ماری جائیں گی کہ کس منہ سے ہم سے مانگتے ہو‘ ہم سے مکالمہ کرتے ہو؟ تمہارا منہ نہیں ہے کہ ہم سے مخاطب ہو! ——— اور سب سے بڑی بات یہ کہ اگر خدانخواستہ پاکستان ختم ہو جائے‘ کروڑوں مسلمان قتل ہو جائیں اور ہم بھی قتل ہو جائیں‘ تب بھی اگر ہم توبہ کر کے اللہ کے دین کے قیام کی جدوجہد کر رہے ہوں گے تو ہماری آخرت تو سنور جائے گی۔ پاکستان کوئی ہمارے ایمان میں تو داخل نہیں ہے۔ بقول اقبال ؎

تو نہ مٹ جائے گا ایران کے مٹ جانے سے
نشۂ مے کو تعلق نہیں پیمانے سے!

حقیقت یہ ہے کہ ایک وقت میں ایک قوم حال میں آ گئی تھی اور اس کا نتیجہ معجزہ کی شکل میں نمودار ہو گیا۔ لیکن پھر ہم نے وعدہ خلافی کی تو منافقت کا روگ اللہ نے ہمارے دلوں میں ڈال دیا۔ یہ مباحث میں سورۃ التوبۃ کی آیات ۷۵‘۷۶‘۷۷ کے حوالے سے بارہا بیان کر چکا ہوں۔ انفرادی توبہ تو آپ فوری طور پر آج ہی کر سکتے ہیں کہ اے اللہ! میں وعدہ کرتا ہوں کہ میری زندگی میں کوئی خلافِ شریعت چیز نہیں ہو گی‘ میرے گھر میں شرعی پردہ ہو گا‘ میری کمائی میں کوئی حصہ حرام کا نہیں ہو گا! ——— اس کے علاوہ ایک ہے ریاست کی سطح پر اجتماعی توبہ۔ یعنی پاکستان میں اسلام کے نظامِ عدلِ

اجتماعی کا قیام اور شریعت اسلامی کا نفاذ! دستور پاکستان میں اس کی بنیاد بھی پڑ چکی ہے لیکن دستور کی اسلامی دفعات کے پوری طرح مؤثر ہونے کی راہ میں چند چور دروازے حائل ہیں' جن کی بنا پر ہمارا دستور منافقت کا پلندہ بن کر رہ گیا ہے۔ چنانچہ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ ان چور دروازوں کو بند کیا جائے تا کہ اسلامی نظام کے قیام اور شریعت کے نفاذ کا عمل ہموار اور تدریجی طور پر آگے بڑھ سکے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس دستوری اور آئینی توبہ کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت لازماً ہمارے شامل حال ہو جائے گی اور قومِ یونسؑ کی طرح اللہ تعالیٰ ہماری اس توبہ کو قبول فرما لے گا اور ہمارے سروں پر منڈلانے والے عذابِ الٰہی کے بادل چھٹ جائیں گے۔ ہم اسی امید کے سہارے جی رہے ہیں اور اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ میری دعوت رجوع الی القرآن کی دعوت ہے' جسے لے کر میں قریہ قریہ' نگری نگری' ملک ملک گیا ہوں اور پکار لگائی ہے۔ بقول اقبال ؎

دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں
کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں!

اقول قولی ھذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

کربلا سے مکہ تک

آمریت کے خلاف جدوجہد کی داستانِ عزیمت

حافظ محبوب احمد خان

ایم اے علوم اسلامیہ و تاریخ

پیش لفظ

حق و باطل کی کشمکش شروع سے چلی آ رہی ہے۔ حق پرستوں نے کبھی باطل کا ساتھ نہیں دیا۔ حق کی حمایت میں جان کی بازی لگانا مؤمن کے لیے مقام شہادت ہے۔ یہ سب سے مشکل کام ہے جان کس کو پیاری نہیں ہوتی۔ مگر رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: جابر سلطان کے سامنے کلمۂ حق کہنا سب سے بڑا جہاد ہے۔ حب جاہ اور حصولِ اقتدار کی خواہش انسان کو اندھا کر دیتی ہے پھر مقتدر لوگوں کو بہت سے خوشامدی مل جاتے ہیں جو اس کو سبز باغ دکھاتے اور گمراہ کرتے ہوئے اپنی عاقبت بھی برباد کرتے ہیں۔ نواسۂ رسولؐ نے بھی حق کی حمایت میں آمریت کے خلاف جدوجہد کرتے ہوئے اپنی اور اپنے اہل وعیال کی جان جان آفرین کے سپرد کر دی اور خلافت کی بجائے ملوکیت کو قبول نہ کیا۔ یہ تھے نواسہ رسولؐ۔ اسی طرح نواسہ صدیق اکبر یعنی رسول اللہ ﷺ کے پھوپھی زاد عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما تھے جنہوں نے اس راہ میں شہادت کو گلے لگایا اور بمصداق

ثبت است بر جریدہ عالم دوام

ابدی زندگی حاصل کر لی۔ انہی دو کرداروں کی عظمت اس کتابچے میں واضح کی گئی ہے۔ سچ ہے کہ فتح ہمیشہ حق ہی کی ہوتی ہے آج اُمت کو ان جان نثاروں پر فخر ہے۔ پھر ہمارے لیے اس میں واضح سبق موجود ہے کہ لگی لپٹی کا خوشامدانہ اور معذرت خواہانہ رویہ ترک کریں اور حق اور سچ کا ساتھ دیں کہ اسی میں حقیقی کامیابی ہے۔ قرآن کا فیصلہ ہے:

''جو حق کی خاطر جان دے دیں انہیں مردہ نہ کہو کہ وہ زندہ ہیں لیکن تم شعور نہیں رکھتے''۔ (البقرۃ)

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ
جوہر ٹاؤن، لاہور

اسلام آمریت کے اندھیروں میں شورائیت کی روشنی لے کر طلوع ہوا۔ اسی اصول پر خلافت راشدہ کا قیام عمل میں آیا۔ دورِ یزید میں اس روشنی کو بجھانے کی کوشش کی گئی مگر اس وقت تک مسلمانوں میں جمہوری روح اور شورائیت سے وابستگی زندہ تھی۔ لہٰذا اسلام کے نظام حکومت کو دوبارہ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے اصول پر قائم کرنے کے لئے جدوجہد اور مزاحمت کی گئی۔ اس جدوجہد میں میں نواسۂ رسولؐ سیدنا حسین بن علی اور نواسہ صدیق اکبرؓ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم کی شخصیات قابل قدر ہیں۔ نواسۂ رسولؐ نے اسلام کے نظام شورائیت کو زندہ رکھنے کی کوشش کی اور ان کی یہ کوشش کربلا کے میدان میں ان کی شہادت پر منتج ہوئی۔ مگر یہ معاملہ کربلا میں ختم نہیں ہوا بلکہ اس کی روشنی میں آمریت کے خلاف شورائیت کی روشنی لے کر طلوع ہونے والی شخصیت حواریٔ رسولؐ کے فرزند حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی ہے جنہوں نے بنوامیہ کی آمریت کے خلاف حسینی مشن کو آگے بڑھایا اور اپنی بارہ سالہ جدوجہد کے دوران اسی راہ میں شہادت پائی۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے اس جدوجہد کو نقطۂ عروج پر پہنچا دیا۔ ان کی شہادت کے ساتھ ہی امت مسلمہ پر صدیوں پر محیط آمریت کے بادل چھا گئے اور آج بھی وسیع وعریض مسلم دنیا آمریت کے سائے میں شورائیت کی اسی روشنی کی تلاش میں ہے جو ان دو اصحاب نے اپنی قربانیوں سے روشن کی تھی۔ یہ مضمون اسلام کے اسی بطل جلیل یعنی حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی قربانیوں کی ایک جھلک ہے۔

حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی والدہ ماجدہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا جلیل القدر صحابیۂ ثانی اثنین حضرت ابوبکر ﷺ کی صاحبزادی تھیں اور بارگاہِ رسالت سے انہیں ''ذات النطاقین'' کا لقب ملا تھا۔ اس نسبت سے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نواسۂ صدیق اکبرؓ اور اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا بھانجا ہونے کے شرف کے ساتھ ساتھ خود اسلام میں ایک پاکباز شخصیت اور قاریٔ قرآن تھے۔ غرض خاندانی شرف وافتخار کے لحاظ سے آپؓ کی ذات میں بہت سی خصوصیات جمع ہوگئی تھیں۔ یہیں سے یہ اندازہ بھی ہو جاتا ہے کہ انہوں نے کس ماحول اور فضا میں آنکھیں کھولیں اور ان کی سیرت کو ایک خاص سانچے میں ڈھالنے کے لئے کون سے عوامل کارفرما رہے۔

حضرت عبداللہ ﷺ کی ولادت تاریخ میں غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے۔ ہجرتِ نبویؐ کے تھوڑے عرصہ بعد حواریٔ رسولؐ حضرت زبیر بن العوام ﷺ نے بھی اپنی والدہ حضرت

صفیہؓ اور زوجہ حضرت اسماءؓ کے ساتھ مدینہ کو ہجرت کی اور قباء میں قیام پذیر ہوئے۔ اس وقت حضرت اسماءؓ حاملہ تھیں۔ ادھر اتفاق سے کچھ مدت سے کسی مہاجر کے ہاں اولاد نہ ہوئی تھی۔ یہودِ مدینہ نے مشہور کر دیا کہ ہم نے مسلمانوں پر جادو کر دیا ہے اور ان کا سلسلۂ نسل منقطع کر دیا ہے' اب ناممکن ہے کہ کسی مسلمان کے ہاں کوئی بچہ پیدا ہو۔ مسلمانوں کو یہود کی باتوں پر یقین تو نہیں تھا' پھر بھی مدینہ کی فضا پر کچھ افسردگی سی طاری تھی۔ عین اُس وقت جب یہود کی شرانگیزی پورے عروج پر تھی' حضرت اسماءؓ کے بطن سے حضرت عبد اللہؓ پیدا ہوئے۔ مسلمانوں کو ان کی پیدائش پر بے حد مسرت ہوئی اور انہوں نے فرطِ انبساط میں اس زور سے نعرہ ہائے تکبیر بلند کئے کہ دشت و جبل گونج اٹھے۔ یہودی سخت شرمندہ ہوئے۔ کیونکہ حضرت عبداللہ کی ولادت سے خدا نے دشمنانِ حق کے چہرے سیاہ کر دیئے اور ان کے جدل و تلبیس کا پردہ چاک کر دیا۔

حضرت اسماءؓ بچے کو گود میں لے کر سرورِ کائناتﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ حضورﷺ نے بچے کو اپنی آغوش میں لے لیا' پھر ایک کھجور منگوائی' دہن مبارک میں ڈال کر اسے چبایا اور پھر اسے اپنے لعابِ دہن کے ساتھ ننھے کے منہ میں ڈالا۔ گویا اس عالمِ رنگ و بو میں آنے کے بعد سب سے پہلے جو چیز حضرت عبداللہ کے شکم میں گئی' وہ سرورِ کائناتﷺ کا لعابِ دہن تھا ع ''یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا!''

تحصیل علم میں حضرت عبداللہؓ نے اپنے والدین اور خالہ سے خوب خوب استفادہ کیا۔ سولہ سترہ برس کی عمر میں ان کا شمار فقہائے عرب میں ہونے لگا۔ آگے چل کر ان کے علم قرآن و حدیث اور فقہ کی وسعت کا اعتراف دوست دشمن سب نے کیا۔

حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے کارہائے نمایاں کا آغاز جہادِ طرابلس سے ہوا۔ طرابلس کی جنگ خلیفۂ ثالث حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت کے مشہور واقعات میں شمار ہوتی ہے۔ اس جنگ میں قلیل التعداد مسلمانوں کو نہایت نامساعد حالات میں محض حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ کی شجاعت' تدبیر اور سیاست کی بدولت ایک طاقتور دشمن پر فتح حاصل ہوئی۔

جنگ جمل میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حمایت کی' مگر اس جنگ کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے تمام عہد خلافت میں حضرت عبداللہ بن زبیر گوشہ نشین رہے۔ امیر معاویہؓ اور حضرت علی مرتضیٰؓ کے جھگڑوں میں انہوں نے مطلق کوئی حصہ نہ لیا۔ ۲۰ رمضان ۴۰ ہجری کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ابن ملجم خارجی کے ہاتھوں جام شہادت پیا اور ان کی

شہادت کے بعد حضرت حسن ؓ سریر آرائے خلافت ہوئے' لیکن حالات نے کچھ ایسی صورت اختیار کی کہ چند ماہ بعد وہ امیر معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دستبردار ہو گئے۔

امیر معاویہؓ ۴۱ ہجری میں حضرت حسنؓ کی دستبرداری کے بعد تمام عالم اسلام کے بلاشرکت غیرے فرمانروا بن گئے۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے جنگ جمل کے بعد جو گوشہ نشینی اختیار کی تھی وہ پورے بیس سال تک جاری رہی۔ کسی جھگڑے میں پڑنے کی بجائے انہوں نے امیر معاویہؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور اس بیعت پر اس وقت تک قائم رہے جب تک امیر معاویہؓ نے یزید کی ولی عہدی کا اعلان نہ کر دیا۔ البتہ دورِ معاویہ میں آپؓ نے ۵۱۔۵۲ ہجری میں قسطنطنیہ کی تسخیر میں ایک عام مجاہد کی حیثیت سے حصہ لیا۔

عبداللہ بن زبیرؓ امن وسکون کے ساتھ اپنی زندگی کے دن گزار رہے تھے کہ ۵۶ ہجری میں امیر معاویہؓ نے یزید کی ولی عہدی کے لئے تگ و دو شروع کر دی۔ ابن زبیرؓ اس وقت اگرچہ بچپن کے پیٹے میں تھے لیکن وہ نوجوانوں کی سی مستعدی کے ساتھ ''موروثی خلافت'' کے خلاف میدانِ عمل میں آ گئے۔

عبداللہ بن زبیرؓ کا امیر معاویہؓ سے مکالمہ

۵۶ ہجری میں حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے امیر معاویہؓ کے دل میں خیال ڈالا کہ خلیفہ کے انتخاب کو عامۃ المسلمین کی رائے پر چھوڑ دینے سے قتل وغارت اور خون ریزی کی بنیاد پڑتی ہے' اس لئے بہتر ہو گا کہ وہ اپنی زندگی میں اپنے فرزند یزید کو اپنا ولی عہد نامزد کر دیں۔ لیکن جب اس معاملہ پر غور کیا گیا تو اس راستے میں کئی مشکلات حائل تھیں۔ سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ مسلمانوں میں ابھی تک جمہوری روح باقی تھی اور وہ موروثی خلافت کو پسندیدگی کی نگاہوں سے نہیں دیکھتے تھے۔ اس نظریئے کی ناپسندیدگی کا مظہر وہ خط ہے جو امیر معاویہؓ نے مروان بن حکم کو مدینہ میں بیعت کے لئے لکھا۔ جب مروان نے مدینہ کے ایک اجتماع میں وہ خط پڑھ کر سنایا تو سب سے پہلے فرزند صدیق اکبر عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ نے اٹھ کر کہا:

> ''تمہارا اور معاویہؓ کا یہ ارادہ ہے کہ امتِ محمدیہ میں رسم قیصری جاری کی جائے کہ ایک قیصر مر جائے تو اس کا بیٹا دوسرا قیصر بنے۔ خدا کی قسم اس طرح تو تم جمہور کو خلیفہ کے حقِ انتخاب سے محروم کر رہے ہو''۔

حضرات عبداللہ بن عمرؓ' عبداللہ بن زبیر اور حسین بن علی رضی اللہ عنہم بھی اسی مجمع میں موجود تھے۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ کے تقریر کے بعد وہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور نہایت جوش و

خروش سے یزید کی ولی عہدی کی مخالفت کی۔ بہرصورت امیر معاویہؓ مکہ یا مدینہ میں ان بزرگوں سے خصوصی طور پر ملے' کیونکہ یہ سب نہ صرف اصحابِ رسول ﷺ تھے بلکہ اپنے زہد و اتقاء اور علم و فضل کی وجہ سے بھی عام مسلمانوں میں بہت مقبول و معزز تھے۔ عبداللہ بن زبیرؓ ان سب میں زیادہ تجربہ کار تھے۔ اس لئے سب نے امیر معاویہؓ سے گفتگو کے لئے انہیں اپنا نمائندہ بنایا۔ امیر معاویہؓ کچھ دن خاموش رہے اور ان لوگوں سے نہایت ملاطفت کا برتاؤ کرتے رہے۔ جب ان کی روانگی کا وقت قریب آیا تو انہوں نے سب کو بلایا اور یزید کی ولی عہدی کا ذکر چھیڑا۔ عبداللہ بن زبیرؓ اور ان کے درمیان حسب ذیل گفتگو ہوئی:

امیر معاویہؓ: تم سب میرے عزیز ہو اور تمہیں بخوبی معلوم ہے کہ میں ہمیشہ تمہارے ساتھ صلہ رحمی اور حسن سلوک سے پیش آیا ہوں۔ یزید تمہارا بھائی ہے اور ابنِ عم ہے۔ مسلمانوں کو انتشار اور خون ریزی سے بچانے کے لئے میں چاہتا ہوں کہ تم لوگ اسے خلافت کے لئے نامزد کر دو لیکن حکومت کے اختیارات تم اپنے ہاتھ میں رکھو۔

عبداللہ بن زبیرؓ: اے امیر! ہم تین صورتیں آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں' ان میں سے ایک آپ اختیار کر لیں۔

امیر معاویہؓ: فرمائیے' وہ صورتیں کیا ہیں؟

عبداللہ بن زبیرؓ: سب سے بہتر صورت تو یہ ہے کہ آپؐ رسول اکرم ﷺ کی طرح کسی کو خلافت کے لئے منتخب نہ کریں۔ امت نے جس طرح حضور ﷺ کی وفات کے بعد صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ چن لیا تھا اسی طرح آپ کے بعد بھی خلیفہ چن لیا جائے گا''۔

امیر معاویہؓ: لیکن اب ابوبکر صدیقؓ جیسی ہستی کہاں ہے؟

عبداللہ بن زبیرؓ: تو پھر آپ سنت ابوبکر صدیق پر عمل کیجئے اور اپنا جانشین اس شخص کو بنائیے جو نہ آپ کا رشتہ دار ہو اور نہ آپ کے قبیلے سے ہو۔

امیر معاویہؓ: ابوبکر صدیق کی نگاہ عمرؓ پر پڑ سکتی تھی۔ میرے بعد عمر فاروقؓ جیسا کون ہے کہ جس پر مجھے اعتماد ہو۔

عبداللہ بن زبیرؓ: تو پھر سنت فاروقؓ پر عمل کیجئے کہ چند شخصوں کو نامزد کر دیجئے جن میں نہ آپ کا بیٹا ہو اور نہ کوئی رشتہ دار۔ یہ لوگ آپ کے بعد خلیفہ کا انتخاب اپنے میں سے کر لیں۔

امیر معاویہؓ: کیا ان تین صورتوں کے علاوہ کوئی چوتھی صورت بھی ممکن ہے؟

عبداللہ بن زبیرؓ: جی نہیں۔ کوئی چوتھی صورت ممکن نہیں۔

امیر معاویہؓ اب حضرت حسینؓ، عبداللہ بن عمرؓ، عبدالرحمٰن بن ابی بکر اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم کی طرف متوجہ ہوئے اور پوچھا: آپ لوگوں کی کیا رائے ہے؟ ان سب لوگوں نے بیک زبان جواب دیا۔ ابن زبیرؓ نے آپ سے جو گفتگو کی ہے ہم سب اس کے ایک ایک حرف سے متفق ہیں۔

تاریخ طبری میں ہے کہ اس کے بعد امیر معاویہؓ نے عام مسلمانوں کو یزید کی بیعت کی دعوت دی اور ان پانچوں بزرگوں کے سوا سبھی لوگوں نے یزید کی بیعت کر لی۔ یزید کی بیعت سے انکار کرنے والے دوسرے بزرگوں کی اہمیت بھی اپنی جگہ مسلم تھی لیکن امیر معاویہؓ ایک عظیم مدبر تھے اور ان کی نگاہِ مردم شناس بے حد باریک بین تھی۔ ان سارے بزرگوں کے اوصاف کا اندازہ کر کے انہوں نے محسوس کیا کہ جس شخص کی ذہانت، جرأت اور شجاعت یزید اور بنی امیہ کے لئے سب سے زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتی ہے وہ حواریٔ رسولؐ کا عابد و زاہد فرزند عبداللہ ہے۔

۶۰ ہجری میں امیر معاویہؓ کی وفات کے بعد یزید تخت نشین ہوا۔ امیر معاویہؓ نے حضرت حسنؓ کی خلافت سے دستبرداری کے بعد اپنے بے پناہ سیاسی تدبر سے شام، مصر، عراق اور حجاز تمام اہم صوبوں کو اپنے زیر نگیں کر لیا تھا، تاہم عراق کے مرکزی شہر کوفہ میں ہزار ہا لوگ ایسے تھے جو بدستور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی اولاد کا دم بھرتے تھے۔ ان لوگوں نے بظاہر امیر معاویہؓ کی اطاعت قبول کر لی تھی لیکن بباطن بنوامیہ کے مخالف تھے۔ چنانچہ وہ امیر معاویہؓ سے پوشیدہ حضرت حسینؓ کو وقتاً فوقتاً خطوط بھیجتے رہتے تھے کہ آپ کوفہ تشریف لائیں تو ہم سب آپ کے ہاتھ پر بیعت کر لیں گے۔

امیر معاویہؓ کی زندگی میں حضرت حسینؓ نے اہل کوفہ کے خطوط کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ ان کی وفات کے بعد جب حضرت حسینؓ مکہ تشریف لے آئے تو اہل کوفہ نے انہیں بلانے کے لئے خطوں کا تانتا باندھ دیا۔ بنوامیہ کی مخالفت میں اگرچہ عبداللہ بن زبیرؓ اور امام حسینؓ بالکل متفق تھے تاہم قدرت کو بنوامیہ کے خلاف ان دونوں اولوالعزم ہستیوں کا متحدہ محاذ بنانا منظور نہ تھا۔

حضرت حسینؓ کے ساتھ جو واقعات پیش آئے اور جو کچھ اہل کوفہ نے طرزِ عمل اختیار کیا اور جس طرح کی شرمناک متلون مزاجی دکھائی، شاید ہی تاریخ میں اس کی کوئی مثال مل سکے۔ حضرت حسینؓ کے چچازاد بھائی مسلم بن عقیل کا استقبال ہزاروں لوگوں نے کیا مگر جب میدان میں عمل کا وقت آیا تو اہل کوفہ ان کا ساتھ چھوڑ گئے اور گورنر کوفہ عبیداللہ بن زیاد نے

ان کو ایک بڑھیا کے گھر سے برآمد کر کے قتل کروا دیا۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کوفہ کے بجائے مکہ کو زیادہ بہتر خیال کرتے تھے کہ یہاں پر رہ کر ملوکیت کے خلاف جدوجہد کی جائے۔ چنانچہ انہوں نے حضرت حسینؓ سے کہا کہ آپ کوفہ نہ جائیں بلکہ یہیں پر قیام پذیر ہو کر لوگوں کو اپنی خلافت کی دعوت دیں۔ اہل کوفہ اگر مخلص ہیں تو وہ یہاں آ کر بھی آپ کی مدد کر سکتے ہیں۔ میں بھی ہر قسم کی اعانت کے لئے تیار ہوں۔ حضرت حسینؓ نے اس دعوت کو قبول نہ کیا۔ ابن زبیرؓ اس پر خاموش ہو گئے اور حضرت حسینؓ اپنے مقتل کی جانب کوچ کر گئے۔

سات سے دس محرم ۶۱ ہجری تک حضرت حسینؓ، ان کے اہل وعیال اور جانباز ساتھیوں نے بے مثال ثابت قدمی سے کربلا کے تپتے ہوئے ریگزار میں جان لیوا پیاس کی اذیت برداشت کی۔ اس مظلوم اور مقدس قافلہ کی داستانِ مصیبت بڑی طویل اور دلخراش ہے۔ مختصر یہ کہ ۱۰ محرم الحرام ۶۱ ہجری کو خدا کے یہ جانباز سپاہی وقت کی مہیب طاغوتی قوت سے ٹکرا جامِ شہادت نوش کر گئے۔ کربلا کے حادثۂ فاجعہ کی خبر بہت جلد سارے بلادِ عرب میں پھیل گئی۔ جس جس مسلمان نے اس خبر کو سنا وہ بنی امیہ کی اس شقاوت پر لرز اٹھا اور اس کی آنکھ پُرنم ہو گئی۔

آمریت کے خلاف جدوجہد کا آغاز

جب مکہ میں کربلا کے حادثہ فاجعہ کی خبر پہنچی تو حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کو سخت صدمہ ہوا۔ انہوں نے اہل مکہ کو مسجد حرام میں بلایا اور ان کے سامنے کھڑے ہو کر ایک رقت انگیز تقریر کی۔ آپؓ نے فرمایا:

> لوگو! اہل عراق سے بدتر مخلوق روئے زمین پر نہیں ہے اور عراقیوں میں بدترین کوفہ کے لوگ ہیں۔ انہوں نے بار بار خطوط بھیج کر حسینؓ کو اس لئے بلایا کہ ان کے ہاتھ پر بیعت کریں گے اور ان کی ذاتِ گرامی سے نورِ ہدایت حاصل کریں گے۔ لیکن جب حسینؓ ان کی سرحد پر پہنچے تو ان شقی القلب لوگوں نے اپنے بلائے ہوئے مہمانوں پر پانی تک بند کر دیا اور بنی امیہ کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے مظلوم حسینؓ کو گھیر لیا اور ان کو مجبور کیا کہ یزید کی بیعت کرو اور اپنے آپ کو ابن زیاد کے حوالے کر دو ورنہ جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ۔
>
> واللہ، حسینؓ اس بات سے بخوبی آگاہ تھے کہ وہ بے سروسامان ہیں اور اس گروہِ اشقیا کے مقابلے میں (نظر بظاہر) کامیاب نہیں ہو سکتے، لیکن انہوں نے ذلت کی زندگی کو ٹھکرا دیا اور عزت کی موت قبول کر لی۔ خدا حسینؓ کے قاتلوں کو ذلیل کرے۔

عراقیوں کی یہ بدعہدی اور غداری قابل نفرین بھی ہے اور قابل عبرت بھی۔ لیکن جو مقدر میں تھا وہ ہوا۔ مشیت ایزدی کے سامنے چارہ نہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ حسینؓ کی شہادت کے بعد ہم ان بدکردار لوگوں کے قول و فعل پر بھروسا کر سکتے ہیں؟'' (تمام مجمع جوشدتِ جذبات سے رو رہا تھا با آوازِ بلند پکارا: ہرگز نہیں ہرگز نہیں۔ ہم قاتلانِ حسین اور ان کے ساتھیوں پر اعتبار نہیں کر سکتے)۔ عبداللہ بن زبیرؓ نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا: ''لوگو! خدا کی قسم' یہ لوگ بھروسے کے قابل ہی نہیں' انہوں نے اس عظیم المرتبت شخص کو قتل کیا جو دن کو روزے رکھتا تھا اور رات کو عبادت کرتا تھا۔ جو قرآن خواں اور پاکباز تھا۔ جو ہر لحاظ سے ان سے بڑھ کر خلافت کا مستحق تھا۔ واللہ! حسینؓ روزے کے مقابلے میں بادہ خواری' خوفِ خدا سے رونے کے مقابلے میں رقص و سرود' قرآن کی ہدایت کے مقابلے میں گمراہی اور ذکرِ حق کے مقابلے میں شکاری کتوں کے ذکر کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ خدا ان دھوکے باز قاتلوں کو سخت سزا دے گا''۔

یہاں سے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی جدوجہد کا وہ دور شروع ہوتا ہے جو ان کی شہادت پر منتج ہوا۔ ابن زبیرؓ نے جب تقریر ختم کی تو مجمع فرطِ غم سے نڈھال ہو گیا تھا۔ جب مجمع کے ہوش و حواس بحال ہوئے تو لوگ آپؓ کے گرد جمع ہو گئے اور کہا ''واللہ حسینؓ کے بعد آپ سب سے بڑھ کر مستحق خلافت ہیں۔ حسینؓ کے قاتلوں سے ہم براءت کا اظہار کرتے ہیں۔ آپ ہاتھ بڑھائیں' ہم آپ کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کرتے ہیں''۔

آپؓ نے پہلے تو اس معاملے میں تأمل کیا' مگر لوگوں کے اصرار پر اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا اور محمد بن حنفیہؒ اور عبداللہ بن عباسؓ کے سوا سب نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

اہل مکہ کے بعد ابن زبیرؓ نے تہامہ اور حجاز کے دوسرے لوگوں کو بیعت کی دعوت دی۔ تمام لوگوں نے ان کی آواز پر لبیک کہا اور سارا حجاز یزید کی اطاعت سے منحرف ہو گیا۔ اہل مدینہ بھی یزید کی بیعت توڑ چکے تھے اور انہوں نے اپنا مقامی امیر عبداللہ بن حنظلہؓ کو بنا لیا تھا۔ یزید نے مسلم بن عقبہ کو مدینہ اور اہل مکہ کی سرکوبی کے لئے بھیجا اور اس کو ہدایت کی کہ اہل مدینہ کو پہلے اطاعت کی دعوت دینا اور انہیں سرکشی سے باز رکھنے کے لئے ہر ممکن کوشش کرنا۔ اگر وہ نہ مانیں تو پھر تلوار اٹھانا' اور وہ مار مارنا جو کہ ہمیشہ تمہارا شیوہ رہی ہے۔ اہل مدینہ کو شکست دینے کے بعد تین دن تک مدینہ کو لوٹنا' تین دن کے بعد ہاتھ روک لینا۔ اس بات کا پورا خیال رکھنا کہ علی بن حسینؒ (حضرت زین العابدین) کو کسی قسم کا گزند نہ پہنچے کیونکہ وہ اس

ہنگامہ سے علیحدہ ہیں۔ حصین بن نمیر کو اپنا نائب مقرر کرلو۔ اگر تمہاری بیماری بڑھ جائے تو لشکر کی امارت حصین بن نمیر کے سپرد کر دینا۔

سانحہ کربلا کی طرح واقعۂ حرہ بھی تاریخ اسلام کا ایک انتہائی المناک باب ہے۔ بعض مؤرخین نے یزید کو سانحہ کربلا سے ایک حد تک بریٔ الذمہ قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ لیکن کوئی مؤرخ اس کو واقعۂ حرہ کی ذمہ داری سے مستثنیٰ کرنے کی جرأت نہیں کرسکا۔

مدینہ کو تاخت وتاراج کرنے کے بعد مسلم بن عقبہ اپنے لشکر کے ہمراہ مکہ معظّمہ پر حملہ کے قصد سے روانہ ہوا کیونکہ جب تک حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی شخصیت موجود تھی یزید کی خلافت خطرے میں تھی۔

۲۶ محرم ۶۴ھ کو یہ لشکر مکہ کے سامنے جا پہنچا۔ عبداللہ بن زبیرؓ نے مکہ سے باہر نکل کر اس فوج کا سخت مقابلہ کیا اور اس مقابلے میں ان کے بھائی منذر بن زبیرؓ دادِ شجاعت دیتے ہوئے شہید ہوگئے۔ اس کے بعد آپ نے کھلے مقابلہ کے بجائے مکہ میں محصور ہوکر مدافعت کا فیصلہ کیا۔ حصین بن نمیر نے کوہ ابوقبیس پر منجنیق نصب کر کے خانۂ کعبہ پر آتش باری اور سنگ باری شروع کر دی۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے اس موقع پر کمال استقامت اور بہادری کا مظاہرہ کیا اور ذرہ برابر بھی ہراساں نہ ہوئے۔ وہ نہایت سکون سے حرم میں جا کر نماز میں مشغول ہوجاتے۔ ان کو دیکھ کر اہل مکہ کے حوصلے بھی نہایت بلند تھے اور انہوں نے آخری دم تک شامی لشکر کے مقابلے کا تہیہ کرلیا۔

خوارج کے مذاکرات اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کا طرزِ عمل

اس حالت محصوری میں خوارج کی ایک جماعت مکہ پہنچی۔ اگرچہ خوارج یزید کے تو مخالف تھے، مگر آپؓ کے حامی بھی نہ تھے۔ البتہ ان کا خیال تھا کہ عبداللہ بن زبیرؓ یزید سے بہتر ہیں اور اگر آپؓ خوارج کی ہمنوائی کریں تو وہ شامی لشکر کے مقابلے میں اس مصیبت کے وقت آپؓ کی مدد کر سکتے ہیں۔ اس نازک وقت میں آپؓ کو مدد کی شدید ضرورت بھی تھی، مگر آپؓ نے کسی قسم کا سمجھوتہ اور ان کے نظریات کو تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ چنانچہ نافع اور نجدہ کے ساتھ ملاقات میں آپؓ نے اپنی جدوجہد کے مقاصد بیان کئے اور اسلاف کے بارے میں نیک خیالات کا اظہار کیا۔

نجدہ: آپ کا شیخینؓ (ابوبکر صدیق اور عمر فاروق رضی اللہ عنہما) کے متعلق کیا خیال ہے؟

عبداللہ بن زبیرؓ: وہ بہترین اصحاب اور خلیفہ تھے۔

نجدہ: عثمان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ انہوں نے انصاف اور شریعتِ حقہ کے خلاف کام کئے اور قتل کئے گئے۔ اور پھر علی کے متعلق آپ کیا کہتے ہیں؟ جنہوں نے صفین میں غیر اللہ کو حکم بنایا؟

نافع: ''اور طلحہ اور اپنے والد زبیر کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں جو ایک خلیفہ کے ہاتھ پر بیعت کر لینے کے بعد اس سے لڑے اور حرمِ رسولؐ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو حکمِ الٰہی کے خلاف میدانِ جنگ میں لائے؟'' پھر دونوں بیک زبان بولے: ''اگر آپ ان امور میں ہماری رائے سے متفق ہوں تو ہماری سرفروش جماعت آپ کی حمایت میں شامی لشکر کے خلاف لڑنے کے لئے تیار ہے''۔

عبداللہ بن زبیرؓ: دیکھو تم اپنی رائے کے خود مالک ہو لیکن مجھے کیسے مجبور کر سکتے ہو کہ تمہاری رائے سے اتفاق کروں۔ سرورِ کائناتﷺ کا ارشاد ہے کہ مُردوں کو برائی سے یاد کر کے زندوں کو تکلیف نہ دو۔ اسی لئے حضورﷺ نے عکرمہؓ بن ابوجہل کے سامنے ان کے والد کی مذمت کرنے سے منع فرما دیا تھا کہ ان کا دل آزردہ نہ ہو اور پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو بھی حکم دیا تھا کہ فرعون سے نرمی سے پیش آئیں۔ میں حضورﷺ کا ایک ادنیٰ نام لیوا ہوں، عثمان، علی، طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہم جیسے بزرگوں کی کیسے مذمت کر سکتا ہوں؟''

نجدہ: ''جو شخص ظالم سے بیزار نہیں ہوتا اور بدی کو بدی نہیں کہتا، وہ گنہگار ہے''۔

عبداللہ بن زبیرؓ: بے شک میں ظالموں سے بیزار ہوں اور بدی کو بدی کہتا ہوں''۔

نافع: ''آپ وضاحت کریں کہ کون ظالم ہے؟''

عبداللہ بن زبیرؓ: ''اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ آخرت میں ذاتی اعمال کی پرسش ہوگی۔ یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ تم کسے ظالم سمجھتے تھے؟''

نجدہ اور نافع یہ سن کر چلے گئے۔ دوسرے دن پھر آئے اور ابن زبیرؓ سے اسی قسم کی گفتگو کی۔ عبداللہ بن زبیرؓ نے کھڑے ہو کر ایک عالمانہ خطبہ دیا جس میں خوارج کے تمام دلائل کا دندان شکن جواب دیا۔ پھر ان سے مخاطب ہو کر فرمایا:

> ''بے شک اس نازک وقت میں تمہاری امداد ہمارے لئے بڑی قدر و قیمت رکھتی ہے لیکن مجھے نہ حکومت کی آرزو ہے نہ فتح و شکست کا خیال۔ مَیں تو حق و صداقت کے لئے لڑ رہا ہوں۔ اگر میری مدد کرو گے تو اللہ تمہیں اس کا اجر دے گا۔ اگر نہ کرو گے تو مجھے اللہ کافی ہے۔ مجھے تو اس کی بھی پروا نہیں کہ تم میرے دشمنوں سے جا ملو''۔

یہ تقریر سن کر خوارج مایوس ہو گئے اور واپس چلے گئے۔ اس واقعہ سے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی بلند کرداری کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ وہ دنیا کو دین پر ترجیح دینے کے لئے کسی صورت میں رضامند نہ ہوئے۔ اگر وہ ایک دنیا پرست سیاسی شاطر ہوتے تو ہر صورت میں خارجی جنگجوؤں' جن کی بہادری مسلمہ تھی' کی حمایت حاصل کر لیتے اور بنی امیہ کی حکومت کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکتے۔ لیکن وہ اپنے عقیدہ و اصول پر چٹان کی طرح جمے رہے اور انتہائی مصیبت کے وقت بھی ریاکاری اور منافقت سے کام نہ لیا۔

مکہ مکرمہ کا محاصرہ کم وبیش چونسٹھ دن جاری رہا۔ ابن زبیرؓ کی شجاعت اور بے خوفی کا یہ عالم تھا کہ آپ نے مسجد حرام میں خیمہ نصب کر رکھا تھا۔ نہ آتش بازی کی پروا تھی اور نہ سنگ باری کی۔ خود حصین بن نمیر کا بیان ہے کہ جب میں نے مکہ کا محاصرہ کر رکھا تھا' ابن زبیرؓ اپنے خیمے سے اس طرح نکلتے تھے جس طرح جھاڑی سے شیر نکلتا ہے۔

اس محاصرہ کی شدت سے مکہ کے لوگوں کو بہت تکلیف ہوئی۔ لوگوں کا گھروں سے نکلنا بھی دشوار ہو گیا۔ سنگ باری سے کعبہ کی عمارت کو سخت نقصان پہنچا۔ چھت اور دیواریں شکستہ ہو گئیں۔ اس پر غضب یہ ہوا کہ ایک دن کعبہ کی عمارت کو آگ لگ گئی۔ یہ آگ شامی لشکر کی آتش بازی سے لگی یا کسی اور وجہ سے' اس کے متعلق مختلف روایتیں ہیں۔

مکہ کا محاصرہ ابھی جاری تھا کہ ۱۴ ربیع الاول ۶۴ھ کو یزید نے وفات پائی۔ سب سے پہلے یہ خبر ایک تیز رفتار قاصد کے ذریعے عبداللہ بن زبیرؓ کو ملی۔ انہوں نے ایک دیوار پر چڑھ کر بلند آواز سے پکارا: ''اے اہل شام! تمہارا گمراہ سردار یزید مر گیا۔ اب کیوں لڑ رہے ہو؟''

حصین بن نمیر کی عبداللہ بن زبیرؓ سے ملاقات

یزید کی موت کے ساتھ ہی حصین بن نمیر نے محاصرہ اٹھانے کا حکم دیا۔ کوچ سے قبل اس نے آپؓ سے ''ابطح'' کے مقام پر ملاقات کی درخواست کی۔ دورانِ ملاقات حصین نے آپؓ سے کہا: ''یزید کی موت کے بعد آپ سے زیادہ حق دارِ خلافت میری نظر میں کوئی نہیں ہے۔ میں اور میرے ساتھی آپ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے لئے تیار ہیں۔ آپ ہمارے ساتھ چلیں۔ میں تمام اہل شام کو آپ کی بیعت پر آمادہ کروں گا۔ اہل حجاز پہلے ہی آپ کے ساتھ ہیں۔ اہل شام کی بیعت کے بعد تمام عالم اسلام آپ کو خلیفہ تسلیم کر لے گا۔ اب تک ہمارے

درمیان جو خونریزی ہوئی ہے اسے آپ معاف فرما دیں''۔

ابن زبیرؓ اگر ایک عام سیاسی شاطر ہوتے تو یہ پورے عالم اسلام پر حکومت کرنے کا سنہری موقعہ تھا' لہٰذا حصین بن نمیر جیسے صاحب اثر سردار اور بنو امیہ کے پشت پناہ کی بات فوراً مان لیتے۔ لیکن وہ عام دنیاوی حکمرانوں اور سیاسی شاطروں سے بلند شخصیت تھے۔ امیر معاویہؓ اور خوارج سے جو ان کی گفتگو ہوئی اس سے اقتدار و حکومت کے بارے میں ان کے خیالات کھل کر سامنے آتے ہیں کہ ان کی جد و جہد دنیاوی منفعت کے حصول کے لئے نہ تھی۔

حصین بن نمیر کی واپسی کے بعد ۶۴ ہجری میں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے خانہ کعبہ کی تجدید و تعمیر کی۔ انہوں نے حج کے موقع پر عامۃ المسلمین کے سامنے اپنے ارادہ کا اظہار کیا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے رائے دی کہ خانہ کعبہ کے صرف اس حصہ کی مرمت کرانی چاہئے جو کمزور ہے یا جس کو نقصان پہنچا ہے' باقی عمارت کو بجنسہٖ اسی حالت میں رہنے دیا جائے جس صورت میں وہ عہدِ رسالت میں تھی' لیکن ابن زبیرؓ شدت سے مصر تھے کہ خانہ کعبہ کی تعمیر و تجدید ضروری ہے۔ انہوں نے لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا:

> ''لوگو! ہمارا ذاتی مکان گر جائے تو ہم اس کے بنوانے کے لئے ہر قسم کی سعی و جہد سے کام لیتے ہیں۔ اب اللہ کا گھر ہمارے سامنے گرا ہوا ہے' ہم اس سے کیسے بے اعتنائی برت سکتے ہیں!''

ابن زبیرؓ کعبہ کی تجدید و تعمیر سے ۱۷ رجب ۶۴ ہجری کو فارغ ہوئے۔ یہ شاید ان کی زندگی کا سب سے مسرت بخش دن تھا۔ اس دن انہوں نے نئی عمارتِ کعبہ کو اندرونی اور بیرونی جانب سے اوپر سے نیچے تک مشک اور عنبر سے بسوایا اور اس پر دیبا کا غلاف چڑھوایا۔ کعبہ کی تعمیر ابن زبیرؓ کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ انہوں نے اس کی تعمیر پر دل کھول کر روپیہ صرف کیا اور بڑی ہمت' خلوص اور ایثار سے کام لیا۔ ابن زبیرؓ کے بعد اگرچہ خانہ کعبہ کی کئی بار از سر نو تعمیر ہوئی تاہم اس کے مشرقی' جنوبی اور مغربی حصے آج بھی انہی کی تعمیر کے مطابق ہیں۔

یزید کی وفات کے بعد ۶۴ سے ۶۵ ہجری تک دِمشق سیاسی ابتری کا شکار رہا۔ عجیب بات ہے کہ عبداللہ بن زبیر نے شام کی سیاسی ابتری سے کچھ فائدہ نہ اٹھایا۔ اگر وہ شام میں اپنے حامیوں کو بروقت مدد پہنچا دیتے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ بنی امیہ کا اقتدار ہمیشہ کے لئے نہ ختم ہو جاتا۔ ۶۵ھ میں عالم اسلام کی کیفیت یہ تھی کہ حجاز اور عراق پر عبداللہ بن زبیرؓ کا قبضہ تھا اور

شام اور مصر مروان کے زیر اقتدار تھے۔ یعنی بیک وقت عالم اسلام پر دو خلیفہ تھے۔ دولت و حشمت میں بنی امیہ بلا مبالغہ ابن زبیرؓ پر فوقیت رکھتے تھے لیکن زہد و اتقاء، صبر و استقامت اور احکامِ شریعت کی بجا آوری میں ابن زبیرؓ کا کوئی ثانی بنی امیہ میں نہ تھا۔ ابن زبیرؓ ایک نیک نیت آدمی تھے، جوڑ توڑ کے ماہر اور سیاسی شاطر نہیں تھے۔ وہ نیک نیتی سے بنی امیہ کو حق پر نہیں سمجھتے تھے، اس لئے محض اللہ کے بھروسے پر بیسیوں پریشانیوں کے باوجود آخری دم تک بنی امیہ کے مقابلے میں ڈٹے رہے۔

ابن زبیرؓ اگر ایک جانب بنی امیہ کے مدمقابل تھے تو دوسری جانب ابن زیاد کے ہاتھوں ''توابین'' کی شکست کے بعد اس تحریک کے باقی ماندہ لوگوں کو مختار بن ابی عبید ثقفی نے انتقامِ حسینؓ کے نام پر اپنے گرد اکٹھا کر لیا تھا اور کوفہ اور بصرہ میں یہ تحریک ابن زبیرؓ کی خلافت کے لئے ایک خطرہ بن کر کھڑی ہو گئی تھی۔ عبداللہ بن زبیرؓ کے بھائی حضرت مصعب بن زبیرؓ کی جدوجہد سے مختار کا فتنہ ۱۴ رمضان المبارک ۶۷ ہجری کو اس کے قتل پر ختم ہوا۔ ایسے زیرک اور جنگجو دشمن کا خاتمہ ابن زبیرؓ کی بہت بڑی کامیابی تھی۔ تاہم اس کامیابی کے لئے آپؓ کی بہت سی فوجی طاقت بھی صرف ہو گئی جو بنی امیہ کے خلاف آپؓ کی جدوجہد کو کمزور کر گئی۔ مختار کے خاتمہ کے بعد ہی حالات نے بڑی تیزی سے رخ بدلنا شروع کیا۔ مختار اپنی زندگی میں بنی امیہ اور ابن زبیرؓ دونوں سے نبرد آزما رہا اور یہ دونوں اسی کو اپنا سب سے بڑا حریف سمجھتے رہے۔ اس طرح عبدالملک بن مروان اور ابن زبیرؓ کے درمیان کوئی لڑائی نہ ہوئی۔ مختار کے قتل کے بعد عبدالملک اور ابن زبیرؓ کھلم کھلا ایک دوسرے کے سامنے آ گئے اور دونوں میں کشمکش کا آغاز ہو گیا۔

مصعب بن زبیرؓ کے ساتھ عراقیوں کی غداری اور شہادت

عبدالملک نے مصعب بن زبیرؓ کے لئے، جو عبداللہ بن زبیرؓ کے بھائی اور ان کی جانب سے عراق کے والی تھے، مقابلے کے لئے بڑی زبردست فوج تیار کی۔ اس وقت مصعب اپنے دو بڑے جرنیلوں مہلب بن ابی صفرہ اور عمر بن عبداللہ معمر کو خوارج کی سرکوبی کے لئے فارس روانہ کر چکے تھے۔ مصعبؓ نے اہل عراق پر ضرورت سے زیادہ اعتماد کیا اور یہی اعتماد ان کے لئے مہلک ثابت ہوا۔ عبدالملک نے نہ صرف جنگ کے لئے بہترین تیاری کی بلکہ ہر وہ حربہ استعمال کیا جو مصعبؓ کی فوج کو کمزور کرتا رہا۔ بے تحاشا دولت کے ذریعے مصعبؓ کے

ساتھیوں کو خرید لیا گیا۔ جب عبدالملک کو اطمینان ہو گیا تو اس نے ایک لشکر جرار کے ساتھ عراق کا رخ کیا۔ مصعب بھی مقابلے کے لئے تیار ہو گئے اور دونوں فوجوں نے دیر جاثلیق میں ایک دوسرے کے سامنے پڑاؤ ڈال دیا۔

عبدالملک کی کثیر التعداد فوج دیکھ کر مصعب کے آدمی لڑائی سے جی چرانے لگے۔ اس وقت انہوں نے عراقیوں کے بارے میں تاریخی جملے کہے:

''خدا احنف بن قیس پر رحم کرے' وہ مجھے اہل عراق کی غداری سے ہوشیار رہنے کی تلقین کیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ عراقی فاحشہ عورتوں کی مانند ہیں' جس طرح انہیں ہر روز ایک نیا خاوند درکار ہوتا ہے اسی طرح عراقیوں کو ہر روز ایک نئے امیر کی ضرورت ہوتی ہے''۔

پھر انہوں نے اپنے بھائی عروہ بن زبیرؓ سے پوچھا کہ حسین بن علیؓ نے میدانِ کربلا میں ایسے حالات میں کیا کیا تھا؟ عروہؓ نے واقعہ کربلا کی پوری تفصیل بیان کی اور آخر میں کہا کہ حسینؓ نے غلامی کی زندگی پر موت کو ترجیح دی۔

مصعب نے کہا ''واللہ میں حسینؓ کی پیروی کروں گا''۔ اس طرح عراقیوں نے ایک بار پھر اپنا روایتی کردار ادا کیا اور ایک وقت حضرت مصعبؓ بن زبیر اور ان کا بیٹا عیسیٰ ہی میدان میں رہ گئے۔ عیسیٰ کی شہادت کے بعد جب ایک شامی اس کا سر کاٹنے کے لئے آگے بڑھا تو بے تاب ہو گئے اور اسے ہٹانے کے لئے لپکے۔ پہلے ہی زخموں سے چور چور ہو رہے تھے۔ اب شامیوں نے انہیں نرغے میں لے لیا اور تلواروں کا مینہ برسا دیا۔ حواریٔ رسولؐ کا فرزند مجبور ہو کر اپنے زخمی گھوڑے سے اتر پڑا۔ بدن کے روئیں روئیں سے خون پھوٹ رہا تھا اور کمزوری سے قدم لڑکھڑا رہے تھے لیکن تلوار ہاتھ سے نہ چھوٹتی تھی۔ اسی حالت میں جب ایک شامی عبیداللہ بن زیاد بن ظبیان نے ان پر اپنے نیزے سے وار کیا تو انہوں نے تلوار کا ایک بھرپور وار کر کے اسے زخمی کر دیا لیکن اب قوت مدافعت نے بالکل جواب دے دیا۔ عبیداللہ نے آگے بڑھ کر ان کو ہمیشہ کی نیند سلا دیا۔ اس طرح عبداللہ بن زبیرؓ کا دست راست اور مخلص ترین معتمد ایک بار پھر عراقیوں کی غداری کی وجہ سے شہید ہو گیا۔ ابن اثیر کا بیان ہے کہ مصعب کا سر کوفہ اور مصر میں پھرایا گیا اور پھر اسے دِمشق لے کر جا کر منظر عام پر لٹکا دیا گیا۔

عبدالملک کی بیوی عاتکہ بنت یزید نے اس پر سخت احتجاج کیا اور عبدالملک سے کہا کہ کیا تمہارا جی ابھی تک ٹھنڈا نہیں ہوا' اب اس سر کی نمائش کرتے ہو۔ اس کے بعد اس نے اس سر کو اتروا

کر غسل دلوایا اور دفن کرا دیا۔ یہ واقعہ ۷۱ ہجری میں پیش آیا۔ اہل عراق کی غداری ایک عجیب واقعہ ہے۔ ان کی غداری کا محرک ان کی سازشی' حریصانہ اور بزدلانہ فطرت رہی جو میدانِ کربلا میں حضرت حسینؓ کی شہادت کا باعث ہوئی۔ وہی عوامل مصعب بن زبیرؓ کی شہادت کا بھی باعث ہوئے۔ عبداللہ بن زبیرؓ کو جب مصعب کے قتل کی اطلاع ملی تو انہیں سخت صدمہ پہنچا۔ مصعب ان کے محبوب بھائی اور حقیقی بہی خواہ تھے بلکہ ان کی طاقت کا سب سے بڑا ستون تھے۔ انہوں نے اس موقع پر اہل مکہ کو جمع کر کے ایک دلدوز تقریر کی:

''مصعب کے قتل کی خبر بیک وقت ہمارے لئے رنج اور خوشی کا باعث ہے۔ رنج اس لئے کہ ہمارا سچا دوست ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گیا۔ خوشی اس لئے کہ اسے شہادت نصیب ہوئی۔ وہ میرا مددگار تھا اور اہل عراق کا خیر اندیش۔ اہل عراق بڑے منافق اور محسن کش ہیں۔ انہوں نے مصعب کی نیکیوں اور احسانات کو بڑی کم قیمت پر بیچ ڈالا۔ خدا کی قسم ہم ابوالعاص کی اولاد کی طرح بستروں پر نہیں مریں گے۔ ہم تیروں کے زخم کھا کر تلواروں کے نیچے جان دے دیتے ہیں۔ اے لوگو دنیا بے ثبات ہے' اگر ہمارے پاس آئے گی تو ہم اسے رذیل اور کمینہ لوگوں کی طرح نہ لیں گے' اگر ہم سے دور ہو گی تو ہم اس پر نامردوں اور ناشکروں کی طرح نہ روئیں گے۔ بس میں اپنے اور تمہارے لئے خدا تعالیٰ سے رحمت اور مغفرت طلب کرتا ہوں''۔

مصعب بن زبیرؓ کا قتل عبدالملک کی عراق پر حکمرانی کا آغاز تھا۔ عراق پر مکمل تسلط کے بعد عبدالملک نے مکہ معظّمہ پر فوج کشی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اس کام میں سب سے بڑی دقت یہ تھی کہ حرمِ اقدس پر حملہ کرنے کے لئے کوئی سردار تیار نہ تھا۔ سرداروں کی اکثریت کا خیال تھا کہ خانہ کعبہ کو میدانِ جنگ بنانا عذابِ الٰہی کا باعث ہو گا۔ بالآخر عبدالملک نے ایک دن تمام عمائدین بنی امیہ اور اپنے دوسرے بہی خواہوں کو جمع کیا اور منبر پر چڑھ کر کہا: ''تم میں سے کون ابن زبیرؓ کو ختم کرنے کا بیڑا اٹھاتا ہے؟''۔ عبدالملک کے سوال پر حجاج بن یوسف ثقفی اٹھ کھڑا ہوا اور کہا ''امیر المومنین یہ کام میرے سپرد کر دیجئے''۔ عبدالملک نے مکہ معظّمہ پر حملہ کے لئے حجاج کو نامزد کر دیا اور تین ہزار آدمی اسے دے کر حکم دیا کہ فی الحال اہل مدینہ سے تعرض کرتے ہوئے سیدھے طائف پہنچ کر قیام کرنا اور وہاں سے چھوٹے چھوٹے دستے مکہ معظّمہ پر حملہ کے لئے روانہ کرنا تاکہ ابن زبیرؓ کی طاقت کا خوب اندازہ ہو جائے۔

مکہ معظّمہ کا محاصرہ اور ابن زبیرؓ کی شجاعت

حجاج آندھی اور طوفان کی طرح حجاز کی طرف بڑھا اور مدینہ منورہ کو ایک طرف چھوڑتے ہوئے سیدھا طائف پہنچ کر قیام پذیر ہوا۔ یہاں سے وہ عبدالملک کی ہدایت کے مطابق چھوٹے چھوٹے دستے مکہ معظّمہ کی طرف روانہ کرتا۔ کئی مہینے اس طرح گزرے تو حجاج نے عبدالملک سے مکہ معظّمہ کے محاصرہ کی اجازت مانگی۔ عبدالملک نے نہ صرف اجازت دے دی بلکہ پانچ ہزار آدمیوں پر مشتمل مزید کمک بھی روانہ کر دی۔ یہ کمک ملتے ہی حجاج نے کوہ ابوقبیس پر منجنیقیں لگا کر خانہ کعبہ پر سنگ باری شروع کر دی۔ یہ سنگ باری اتنی شدید تھی کہ بڑے بڑے بہادروں کا پتہ پانی ہوتا تھا۔ حجاج نے صرف سنگ باری پر ہی اکتفا نہ کیا بلکہ اس نے حکم دیا کہ آگ کے گولے بنا بنا کر پھینکے جائیں تاکہ سنگ باری اور آتش باری مل کر زیادہ کاری ضرب لگا سکیں اور ابن زبیرؓ اور ان کے ساتھی اطاعت قبول کر لیں۔ ادھر ابن زبیرؓ نہایت حوصلہ سے ان آفات کا مقابلہ کر رہے تھے۔ ان کے پائے استقلال میں لحہ بھر کے لئے بھی لغزش پیدا نہ ہوئی۔ وہ حرم اقدس میں پناہ گزین تھے اور عین سنگباری کی حالت میں نہایت امن وسکون سے نماز ادا کرتے تھے۔ بڑے بڑے پتھر اور آگ کے گولے ان کے ارد گرد گرتے تھے لیکن وہ برابر عبادت میں مصروف رہتے تھے۔

حجاج نے محاصرہ میں اتنی سختی برتی کہ خوراک کا ایک دانہ بھی مکہ کے اندر نہیں جا سکتا تھا۔ شروع شروع میں ابن زبیرؓ کے پاس کافی سامانِ رسد تھا' لیکن جوں جوں محاصرہ طویل ہوتا گیا' سامان رسد میں کمی ہوتی گئی۔ حتیٰ کہ لوگوں نے اپنے گھوڑے ذبح کر کے کھانے شروع کر دیئے۔ مکہ میں عام قحط پڑ گیا اور اشیائے خوردنی انتہائی گراں ہو گئیں۔ مکہ کے لوگ گھبرا اٹھے اور آہستہ آہستہ ابن زبیرؓ کا ساتھ چھوڑ کر مکہ سے باہر نکل کر حجاج کی اطاعت قبول کرنے لگے۔ تھوڑے ہی دنوں میں دس ہزار آدمی ابن زبیرؓ کا ساتھ چھوڑ گئے۔ یہ محاصرہ چھ ماہ سے زیادہ عرصہ جاری رہا۔ اسی دوران میں حج بھی ہوا۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے پیغام پر حجاج نے ایامِ حج میں سنگ باری بند کر دی لیکن عبداللہ بن زبیرؓ کو اس نے میدانِ عرفات میں جانے کی اجازت نہ دی اور نہ خود اس نے خانہ کعبہ کا طواف کیا۔ حج کے بعد اس نے دوبارہ سنگ باری شروع کر دی اور ساتھ ہی امان نامے بھی ابن زبیرؓ کے ہمراہیوں کے پاس بھیجنے شروع کر دیئے۔ اس کی یہ تدبیر کارگر رہی اور ابن زبیرؓ کے رہے سہے ساتھیوں میں سے اکثر حجاج کی امان میں آ گئے۔ اس حالت میں انہیں حجاج کا ایک خط ملا جو

اس نے انہیں عبدالملک کے حکم کی تعمیل میں لکھا تھا۔ اس خط میں لکھا تھا:

''آپ اچھی طرح جان گئے ہوں گے کہ اب آپ کے پاس نہ کوئی طاقت ہے اور نہ کوئی آپ کا مددگار۔ اب آپ مجبورِ محض ہیں۔ آپ کے لئے بہترین راہِ عمل یہی ہے کہ آپ میری امان میں آ جائیں اور امیر المومنین عبدالملک کی بیعت کر لیں۔ امیر المومنین وعدہ کرتے ہیں کہ آپ کی پوری عزت کی جائے گی اور آپ جو طلب کریں گے آپ کو دیا جائے گا۔ امیر المومنین نے مجھے حکم دیا تھا کہ آپ کو امن و صلح کی طرف مائل کروں اور آپ کے قتل میں جلدی نہ کروں''۔

ابن زبیرؓ نے حجاج کے خط کا کوئی جواب نہ دیا اور کوہِ استقامت بن کر مقابلے پر ڈٹے رہے۔ آخر کار صرف پانچ فدا کاران کے ساتھ رہ گئے۔ اسی حالت میں ایک دن اپنی جلیل القدر والدہ ماجدہ حضرت اسماءؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پوچھا: ''اماں جان! آپ کا کیا حال ہے؟''

حضرت اسماءؓ: میرا حال کیا پوچھتے ہو؟ بصارت زائل ہو چکی ہے۔

ابن زبیرؓ: اماں جان! موت میں بڑی راحت ہے۔

حضرت اسماءؓ: بیٹے! میں تمہارا انجام دیکھ کر مرنا چاہتی ہوں تا کہ اگر تمہیں شہادت نصیب ہو تو اپنے ہاتھ سے تمہارا کفن دفن کروں اور اگر تم فتح پاؤ تو میرا دل ٹھنڈا ہو''۔

ابن زبیرؓ ہنس پڑے اور دس دن بعد سلام رخصت کے لئے ان کی خدمت میں پھر حاضر ہوئے۔ اس وقت وہ مسجد حرام میں تشریف فرما تھیں۔ ابن زبیرؓ اس وقت زرہ بکتر پہنے ہوئے تھے اور والدہ سے رخصت ہو کر سیدھے میدانِ جنگ میں جانے کا ارادہ تھا۔ ماں سے عرض کیا:

''اماں جان! محاصرے کو سات ماہ گزر گئے ہیں۔ میرے تمام ساتھی میرا ساتھ چھوڑ گئے ہیں۔ یہاں تک کہ میرے دو بیٹے (حمزہ اور خبیب) بھی حجاج کی امان میں چلے گئے ہیں۔ صرف چار پانچ آدمی اور میرا لختِ جگر زبیر اس وقت میرے ساتھ ہیں۔ حجاج مجھے امان دیتا ہے اور عبدالملک نے وعدہ کیا ہے کہ جو طلب کروں گا وہ دے گا۔ فرمائیے ایسی حالت میں آپ کا کیا حکم ہے؟''

صدیق اکبرؓ کی جلیل القدر بیٹی نے جواب دیا: ''بیٹا! تم اپنے معاملے کو مجھ سے بہتر سمجھتے ہو۔ اگر تم حق پر ہو تو جاؤ جس راہ میں تمہارے ساتھیوں نے جانیں دی ہیں اسی راہ میں تم بھی جان دے دو۔ اگر تم ناحق محض دنیا کے لئے لڑے تو بہت برا کیا' مسلمانوں کا خون

بہایا' ساتھیوں کی جانیں گنوائیں اور خود کو ہلاکت میں ڈالا''۔

ابن زبیرؓ کہنے لگے: ''اماں !میں حق وصداقت کے لئے لڑا اور حق وصداقت کے لئے ساتھیوں کو لڑایا۔صرف موجودہ صورتِ حال سے آپ کو آگاہ کرنے کے لئے حاضر ہوا ہوں''۔

حضرت اسماءؓ نے جواب دیا: ''اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ تم حق پر تو ہو لیکن اب حالات کی ناموافقت اور ساتھیوں کے نہ ہونے کے باعث دشمنوں سے دب جاؤ تو یہ شریفوں اور دینداروں کا شیوہ نہیں''۔

ابن زبیرؓ نے جواب دیا: '''اماں! میں موت سے نہیں ڈرتا۔صرف یہ خیال ہے کہ میری موت کے بعد دشمن میری لاش کا مثلہ کریں گے اور صلیب پر لٹکائیں گے''۔

حضرت اسماءؓ نے فرمایا: ''بیٹے! بکری جب ذبح کر ڈالی جائے تو پھر اس کی کھال کھینچی جائے یا اس کے جسم کے ٹکڑے کر دیئے جائیں' اسے کیا پروا؟.....تم اللہ پر بھروسا کر کے اپنا کام کرو۔راہِ حق میں تلواروں سے قیمہ ہونا گمراہوں کی غلامی سے ہزار درجہ بہتر ہے۔موت کے خوف سے غلامی کی ذلت کبھی قبول نہ کرنا!''

اپنی جلیل القدر والدہ کے حوصلہ افزا کلمات سن کر ابن زبیرؓ پر رقت طاری ہوگئی اور فرطِ محبت سے انہوں نے اپنی والدہ کا سر چوم لیا۔پھر عرض کیا: ''اماں جان' میرا بھی یہی ارادہ تھا کہ راہِ حق میں مردانہ وار لڑ کر جان دوں لیکن آپ سے مشورہ کرنا میں نے ضروری سمجھا تا کہ میرے مرنے کے بعد آپ رنج وغم نہ کریں۔الحمد للہ کہ میں نے آپ کو اپنے سے بڑھ کر ثابت قدم پایا۔آپ کی باتوں نے میرا ایمان تازہ کر دیا ہے۔آج میں ضرور قتل ہو جاؤں گا۔مجھے یقین ہے کہ میرے قتل کے بعد بھی آپ اسی طرح صبر وشکر سے کام لیں گی۔میں سچ عرض کرتا ہوں کہ میں نے کبھی برائی کو پسند نہ کیا۔کسی مسلمان پر ظلم نہیں کیا۔کبھی بدعہدی نہ کی۔کبھی امانت میں خیانت نہ کی۔میرے کسی عامل نے کبھی کوئی بیجا کام کیا تو اس کی حوصلہ شکنی کی۔اللہ اور اس کے بندوں کے حقوق پورے کرنے میں جو کچھ ہو سکا کیا۔اللہ کی رضا کے سوا مجھے کوئی شے مطلوب نہیں''۔

پھر آسمان کی جانب نظر اٹھائی اور کہا: ''باری تعالیٰ! میں نے یہ باتیں فخر کی راہ سے نہیں کہیں بلکہ اپنی والدہ محترمہ کی تسکین اور اطمینان کے لئے کہی ہیں''۔

حضرت اسماءؓ نے دعا دی اور فرمایا: ''بیٹے! تم اللہ کی راہ میں جان دو۔میں ان شاء اللہ صابر وشاکر رہوں گی۔اب آگے آؤ تا کہ میں آخری بار تمہیں پیار کروں''۔

عبداللہؓ آگے بڑھے۔ نابینا اور ضعیف العمر ماں نے اپنے لختِ جگر کو گلے لگا لیا۔ اتفاقاً ان کا ہاتھ عبداللہؓ کی زرہ پر پڑ گیا۔ پوچھا: ''بیٹے یہ تمہارے جسم پر کیا ہے؟''

ابن زبیرؓ: ''اماں جان! زرہ ہے تاکہ دشمن کے حملوں سے بچاؤ ہو''۔

حضرت اسماءؓ نے فرمایا: ''بیٹے! اللہ کی راہ میں شہید ہونے کے لئے نکلتے ہو اور ان عارضی چیزوں کا سہارا لیتے ہو؟''

ابن زبیرؓ نے اسی وقت زرہ اتار کر پھینک دی۔ سر پر سفید رومال باندھ لیا اور ماں سے کہا: ''اماں جان! اب میرے جسم پر معمولی لباس ہے''۔ حضرت اسماءؓ: بیٹا! اب میں خوش ہوں۔ جاؤ اللہ کے راستے میں لڑو اور اس کے ہاں اسی لباس میں جاؤ!''

نواسۂ صدیق اکبرؓ مقتل گاہ میں

عبداللہ بن زبیرؓ نے قمیص کے دامن اٹھا کر کمر سے باندھ لئے اور دونوں ہاتھوں میں تلواریں پکڑ کر رجز پڑھتے ہوئے رزم گاہ میں پہنچے۔ ان کے ساتھ گنتی کے چند فدا کار تھے جن میں ان کا ایک صاحبزادہ ایک پہلو میں اور دوسرے پہلو میں ابن صفوان تھا۔ ابن زبیرؓ اگرچہ بہتر برس کے بوڑھے تھے لیکن ان کی شجاعت اور ہیبت شیر ببر کی سی تھی۔ کسی شامی کو ان کا مقابل ہونے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ اب حجاج نے خود پیدل فوج کا ایک چیدہ دستہ لے کر ابن زبیرؓ کے علمبردار کو گھیر لیا۔ ابن زبیر اپنے علمبردار کو شامیوں کے نرغے سے نکال کر مقام ابراہیم پر نماز پڑھنے چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی شامیوں نے ان کے علمبردار کو پھر گھیر لیا اور علَم چھین کر قتل کر ڈالا۔ ابن زبیر نماز سے فارغ ہوئے تو ایک قریشی نے عرض کیا: ''آپ اجازت دیں تو میں کعبہ کا دروازہ کھول دوں تاکہ آپ اس میں داخل ہو جائیں اور دشمن کی زد سے محفوظ ہو جائیں؟'' ابن زبیرؓ نے جواب دیا: ''ایسی حالت میں مجھ سے بڑھ کر ذلیل انسان کون ہوگا جس نے پہلے اپنے ساتھیوں کو قتل ہونے کے لئے دشمن کے سامنے کر دیا اور اب موت سے بھاگ نکلا' اور پھر شامیوں نے پہلے کعبہ کا احترام کب کیا ہے' جواب کریں گے؟'' اسی اثناء میں شامی فوجیں ہجوم کر کے مسجد حرام تک آ پہنچی تھیں۔ اب زبیر کے ساتھ اب صرف دو فدا کار تھے۔ لیکن وہ حیرت انگیز پامردی اور چابکدستی سے لڑ رہے تھے۔ ظہر کے وقت تک وہ بیسیوں شامیوں کو ہلاک کر چکے تھے۔ خون زیادہ نکل جانے کی وجہ سے اب قوتِ مدافعت جواب دیتی جا رہی تھی۔ اسی حالت میں شامیوں نے نرغہ کر کے ان پر تلواروں کا مینہ برسا دیا اور ہجرت کے بعد اسلام کا نومولودِ اول' حواریٔ رسولؐ اور ذات النطاقین کا

فرزند اور اپنے وقت کا جری اور شجاع ترین انسان جام شہادت پی کر ہمیشہ کے لئے دنیا کی نظروں سے روپوش ہوگیا۔ان کے دوساتھی بھی ان پر فدا ہوگئے۔شامیوں نے فوراً ابن زبیرؓ کا سر کاٹ لیا اور حجاج کو ان کی شہادت کی خوشخبری سنائی۔ یہ واقعہ جمادی الاخریٰ ۷۳ ہجری میں سہ شنبہ کے دن پیش آیا۔صحیح تاریخ کے متعلق مؤرخین میں اختلاف ہے۔

ابن زبیرؓ کا سر دِمشق میں عبدالملک کے پاس بھجوادیا گیا اور جسم مقام حجون میں سولی پر الٹا لٹکا دیا گیا۔حضرت اسماءؓ کو حجاج کی حرکت کا علم ہوا تو انہوں نے اسے پیغام بھیجا کہ خدا تجھے غارت کرے' تو نے میرے لخت جگر کی لاش کو وار پر کیوں لٹکایا؟ حجاج نے جواب میں کہلا بھیجا: میں لوگوں کو ابن زبیرؓ کے انجام سے عبرت دلانا چاہتا ہوں۔

حضرت اسماءؓ نے پھر اس سے کہلا بھیجا کہ میرے بچے کی لاش میرے حوالے کردو تا کہ میں اس کی تجہیز وتکفین کرسکوں۔مگر حجاج نے اس بار بھی صاف انکار کردیا۔

حضرت اسماءؓ جب حجاج بن یوسف کی طرف سے مایوس ہوگئیں اور انہیں یقین ہوگیا کہ وہ ان کے لخت جگر کی لاش ان کے حوالے نہیں کرے گا تو انہوں نے کسی ذریعہ سے عبدالملک کو دمشق پیغام بھجوایا۔عبدالملک نے اسی وقت حجاج کو ایک غضب آلود خط لکھا جس پر اس کی حرکت پر سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور ابن زبیرؓ کی لاش فوراً حضرت اسماءؓ کے سپرد کرنے کا حکم دیا۔عبدالملک کا حکم پہنچنے پر حجاج نے ابن زبیرؓ کی لاش حضرت اسماءؓ کے حوالے کردی۔

قریب قریب سبھی اربابِ تاریخ وسیر نے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے زہد واتقاء' شجاعت' حق گوئی وبے باکی کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا ہے۔ان کا یہی زہد واتقاء اور دوسرے اوصاف تھے جن کو دیکھ کر عامۃ المسلمین نے ملوکیت کے سیلاب کے آگے بند باندھنے کے لئے انہیں منتخب کیا۔ابن زبیرؓ نے سریر آرائے خلافت ہوکر جو کام سرانجام دیئے ان سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آ گئی کہ عامۃ المسلمین کا انتخاب بالکل جائز اور درست تھا۔انہوں نے اپنے زہد وتقویٰ کو اپنی ذات تک ہی محدود نہ رکھا بلکہ اپنے دورِ خلافت کو خلافتِ راشدہ بنانے کی ہر ممکن کوشش کی اور احیائے سنت کے لئے کسی سعی سے دریغ نہ کیا۔ اتباع سنت میں وہ جس قدر شدت برتتے تھے اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک بار حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور ان کے بھائی عمرو بن زبیرؓ کے درمیان کوئی جھگڑا ہوگیا۔ دونوں نے اپنا جھگڑا چکانے کے لئے حضرت سعیدؓ بن عاص کو حَکَم بنایا۔دونوں حضرات حضرت سعیدؓ بن عاص کے پاس پہنچے تو انہوں نے عبداللہ بن زبیرؓ کے مرتبہ کے پیش نظر ان کو اپنے برابر

مسند پر بٹھانا چاہا۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے فرمایا: میں ہرگز آپ کے ساتھ نہیں بیٹھوں گا کیونکہ یہ سنت نبوی کے خلاف ہے۔ حضورﷺ نے فرمایا ہے کہ مدعی اور مدعا علیہ دونوں منصف کے سامنے برابر بٹھائے جائیں۔ چنانچہ وہ اپنے بھائی کے ساتھ فرش پر بیٹھ گئے۔

بنوامیہ عوام کی حمایت حاصل کرنے کے لئے بادشاہوں کی طرح بے دریغ روپیہ لٹاتے تھے جبکہ ابن زبیرؓ کے ہاں اس طرح کا کوئی معاملہ نہ تھا بلکہ وہ بیت المال کے خرچ کرنے میں خلفاء کی راہ پر گامزن رہے۔ وہ اس بات کو مطلق جائز نہیں سمجھتے تھے کہ بیت المال سے کوئی چیز کسی غیر مستحق کو دی جائے۔ ان کی یہ احتیاط اور کفایت شعاری بعد میں ان کے لئے کئی مصائب کا باعث ہوئی۔ عمال کے انتخاب میں زہد وتقویٰ کو اہمیت دیتے۔ اگر وہ ملکی عہدوں کو سیاسی رشتوں اور جوڑ توڑ کے لئے استعمال کرتے تو آج بنی امیہ کی تاریخ کا نام ونشان بھی نہ ملتا۔ عمال کی پوری طرح نگرانی کرتے تھے' شکایت پر فوری تحقیقات کراتے' درست ہونے پر شکایت کی نوعیت کے مطابق اس کا تدارک کرتے۔ عدلیہ اور انتظامیہ کو ایک دوسرے سے جدا رکھا اور اپنے قضاۃ کو ہدایت کی کہ وہ اپنے فیصلوں کی بنیاد ہمیشہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہﷺ پر رکھیں اور اس معاملہ میں ہرگز کسی کی رورعایت نہ کریں۔

تاریخ اسلام میں پہلی مرتبہ گول درہم ڈھلوائے۔ درہم کے ایک طرف ''محمد رسول اللہ'' اور دوسری طرف ''امر اللّٰہ بالوفاء والعدل'' کے نقش بنوائے۔

حضرت عبداللہ بن زبیر کا حلیہ اپنے نانا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے بہت ملتا جلتا تھا۔ نہایت بارعب شخصیت تھی۔ جسمانی لحاظ سے بہت طاقتور اور دونوں ہاتھوں میں تلواریں پکڑ کر بے دریغ چلا سکتے تھے۔ علامہ جلال الدین سیوطی نے تاریخ الخلفاء میں عمر بن قیس کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:

> ''جب میں عبداللہ بن زبیرؓ کو دنیا کا کوئی کام کرتے دیکھتا تھا تو میں یہ سمجھتا تھا کہ ان کو کبھی خدا یاد نہ آتا ہوگا اور جب دین کا کوئی کام کرتے ہوئے دیکھتا تو سمجھتا تھا کہ ان کو کبھی پلک جھپکنے جتنی دیر کے لئے بھی دنیا کا خیال نہ آتا ہوگا''۔

ایک ایسے دور میں جب ملوکیت نہایت تیزی سے خلافت راشدہ کی جگہ لے رہی تھی' دینی اور اخلاقی اقدار پامال ہو رہی تھیں' سرزمینِ کربلا آلِ رسولؐ کے خون کے چھڑکاؤ سے سرخ ہو چکی تھی' بنوامیہ کے قاہر حکمرانوں کے خلاف مسلمانوں کے دردمند طبقے کی قیادت سنبھالنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ یہ تو شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا تھا۔ اس مقصد کے لئے سر

سے کفن باندھ کر ہی میدان میں اترا جا سکتا تھا۔ ابن زبیرؓ نہ تو سلطان ابنِ سلطان تھے اور نہ صاحبِ طبل وعلَم۔ ان کی سب سے بڑی متاع ان کی گزشتہ بے داغ زندگی اور دین حق سے والہانہ محبت تھی۔ خلافت سے قبل اور خلافت کے بعد زندگی کے ہر دور میں انہوں نے اپنا ظاہر و باطن یکساں رکھا۔ جو موقف پہلے دن حق سمجھ کر اختیار کیا آخر دم تک اس پر ڈٹے رہے۔ نہ کوئی ترغیب وتحریص ان کو اپنی راہ سے ہٹا سکی اور نہ دشمن کی زبردست قوت اور نامساعد حالات ان کو مرعوب کر سکے۔ ان کی جرأت' بے خوفی' شجاعت' استقامت اور حق پسندی دیکھ کر لامحالہ اس بات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ سیدنا حضرت حسینؓ کے بعد عبداللہ بن زبیرؓ ہی حق پسند مسلمانوں کی قیادت کے سزاوار تھے اور کثیر التعداد صلحائے امت سمیت عامۃ المسلمین نے اگر اپنے ہاتھ ان کے ہاتھوں میں دیئے تو کچھ بیجا نہیں کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ اکثر لوگوں نے بعد کے حالات میں ناسازگاری کے آگے ہتھیار ڈال دیئے اور آخری دم تک ابن زبیرؓ کا ساتھ نہ دیا۔ اگر ان کو اپنے جیسے چند ہزار بلکہ چند سو مستقل مزاج اور جری رفقاء مل جاتے تو آج مسلمانوں کی تاریخ یقیناً کسی اور انداز سے لکھی جاتی۔ ابن زبیرؓ کی شہادت کے بعد سب نے جان لیا کہ سیدنا حسینؓ کے بعد بنو امیہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنا ابن زبیرؓ ہی کا کام تھا۔ ان کے بعد کسی میں اتنا حوصلہ نہ تھا کہ اموی اقتدار کے سیلاب کے آگے بند باندھ سکتا۔ جس جدوجہد کا آغاز سیدنا حسینؓ نے میدانِ کربلا سے کیا تھا اس کا اختتام حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی شہادت پر ہوا۔ آپؓ کی شہادت کے ساتھ ہی امت مسلمہ پر صدیوں پر محیط آمریت چھا گئی اور اب تک امت شورائیت کے اس نظام کی منتظر ہے جو فاران کی وادیوں سے طلوع ہوا تھا۔

اس کتابچہ کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتب سے مدد لی گئی ہے:

۱) سیرت عبداللہ بن زبیرؓ' طالب الہاشمی
۲) تاریخ الامم والملوک' طبری
۳) تاریخ الخلفاء' علامہ جلال الدین سیوطی
۴) تاریخ الکامل' علامہ ابن اثیرؒ
۵) تاریخ اسلام' اکبر شاہ خان نجیب آبادیؒ
۶) تاریخ اسلام' معین احمد ندویؒ

نجوم ھدایت

اچھی صحبت

مولانا سید وصی مظہر ندوی

عَنْ ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم :
عَلٰی دِیْنِ خَلِیْلِہٖ فَلْیَنْظُرْ اَحَدُکُمْ مَنْ یُّخَالِلُ))

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''انسان اپنے دوست کے دین اور طریقے پر چلتا ہے' اس لئے دوستی کرتے ہوئے ہر شخص کو دیکھنا چاہئے کہ وہ کس سے دوستی کر رہا ہے۔''

اسی طرح ایک دوسری حدیث ہے:

عن ابی سعید الخدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ عن النبی صلی ا
قال :((لَا تُصَاحِبْ اِلَّا مُؤْمِنًا وَلَا یَاْکُلْ طَعَامَکَ اِلَّا تَقِیٌّ))

یعنی ''صرف مؤمن کی صحبت اختیار کرو' اور تمہارے کھانے پینے کا ساتھی پرہیزگار انسان ہونا چاہئے۔''

حضور اکرم ﷺ نے ان دونوں حدیثوں میں اچھی صحبت اختیار کرنے اور بری صحبت سے بچنے کا حکم دیا ہے۔ آپؐ نے پہلی حدیث میں بتایا ہے کہ آدمی جس شخص کو اپنا دلی دوست بنالیتا ہے آہستہ آہستہ وہ اس کے طور طریقے اپناتا چلا جاتا ہے' یہاں تک کہ بڑھتے بڑھتے وہ اپنا دین چھوڑ کر اُس کا دین بھی اختیار کر لیتا ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ مؤمن کی سب سے بڑی دولت اس کا ایمان ہی تو ہے۔ بری صحبت اور برے دوست کی وجہ سے یہ دولت بھی خطرہ میں پڑ جاتی ہے۔ اسی لئے حضور ﷺ نے نہایت شفقت کے ساتھ ہم کو سمجھایا ہے کہ جب کسی سے دوستی کرنے چلو تو اچھی طرح جانچ پڑتال کے بعد کسی کو دوست بناؤ۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارا دوست تمہارے ایمان و اخلاق کا ڈاکو ثابت ہو۔

دوسری حدیث میں آنحضرت ﷺ نے دلی دوست بنانے سے پہلے صحبت اور کھانے پینے میں شرکت کی جو منزلیں آتی ہیں ان کے بارے میں ہدایت دی ہے اور بتایا ہے کہ اپنا اُٹھنا بیٹھنا اہل ایمان کے ساتھ رکھو۔ کیونکہ جب آدمی اپنا اٹھنا بیٹھنا ایمان والوں کے ساتھ رکھے گا تو دوست بھی انہی میں سے چنے گا۔ مزید فرمایا کہ تم صرف ان لوگوں کو اپنا ہم نوالہ و ہم پیالہ بناؤ جو پرہیزگار اور اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ جب صحبت سے آگے کا مرحلہ آئے اور کھانے پینے میں شرکت کرنی ہو تو اہل ایمان میں سے بھی اُن لوگوں کو منتخب کرو جو اللہ سے ڈرنے والے ہوں۔

ظاہر ہے کہ جب ہمارا اُٹھنا بیٹھنا اہل ایمان کے ساتھ ہوگا اور کھانے پینے میں شریک ایسے اہل ایمان ہوں گے جو اللہ سے ڈرنے والے ہوں تو پھر ہمارے دلی دوست انہی ایمان اور تقویٰ والے لوگوں میں سے ہوں گے۔ اور ایسے لوگوں کی صحبت اور دوستی ایمان کی مضبوطی اور اخلاق کی بلندی کا ذریعہ بنتی ہے۔

صحبت ایسی چیز ہے کہ جس کی تاثیر کا انکار کوئی شخص نہیں کرسکتا۔ اچھی صحبت اور دوستی سے آدمی کے ایمان اور اخلاق سدھر جاتے ہیں۔ اسی طرح بری صحبت انسان کے ایمان و اخلاق کے لئے سخت خطرہ ہے۔ اچھے گھرانوں کے کتنے ہی ہُونہار لڑکے بری صحبت میں پھنس کر تباہ ہو جاتے ہیں اور کتنے ہی بگڑے ہوئے لوگ اچھی صحبت میں رہ کر سدھر جاتے ہیں۔

صحبتِ صالح ترا صالح کند
صحبتِ طالح ترا طالح کند!

پھولوں کی صحبت میں رہنے والی مٹی بھی مہکنے لگتی ہے اور حضرت نوح علیہ السلام جیسے برگزیدہ نبی کا بیٹا برے لوگوں کی صحبت میں بیٹھ کر خاندانِ نبوت کی برکتوں سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس لئے ہم سب کو اچھی صحبت اختیار کرنی چاہئے اور بری صحبت سے دور رہنا چاہئے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین oo

نمائش اور دکھاوا

عتیق الرحمٰن صدیقی

سورۃ الانفال میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَرِئَاءَ النَّاسِ وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ۚ وَاللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ﴾ (الانفال)

''اور ان لوگوں کی مانند نہ بننا جو اپنے گھروں سے اکڑتے اور لوگوں کے آگے اپنی نمائش کرتے نکلے اور جو اللہ کی راہ سے روکتے ہیں' حالانکہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں اللہ سب کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔''

مکہ کے قریش جنگ بدر کے لئے اپنے گھروں سے بڑے گھمنڈ' طنطنے اور غرور سے نکلے تھے۔ انہیں اپنی تعداد' اپنے سروسامان اور طاقت پر بڑا ناز تھا' مگر اس تمام تر آن بان کے باوجود اللہ نے انہیں شکست دی اور ایمان والوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ مشرکوں کے رنگ ڈھنگ اختیار نہ کرو' ریاکاری اور دکھاوے سے بچو اور ہرگز شیخی نہ بگھارو! اس لئے کہ یہ روش تمہارے ربّ کو ہرگز پسند نہیں۔

جنگ حنین کے موقع پر زیادہ تعداد میں ہونے کی وجہ سے جب مسلمان اترانے لگے اور غرور میں مبتلا ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ فِي مَوَاطِنَ كَثِيرَةٍ ۙ وَيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنكُمْ شَيْئًا وَضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُم مُّدْبِرِينَ﴾ (التوبة)

''اللہ بہت سے مواقع پر تمہاری مدد کر چکا ہے اور حنین کے دن جب کہ تمہاری کثرت نے تمہیں غرور میں مبتلا کیا تو وہ کثرت تمہارے کچھ کام نہ آئی اور زمین اپنی وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی' پھر تم پیٹھ پھیر کر بھاگے۔''

اعمال کی اچھائی اور برائی کا دار و مدار نیت پر ہے' اسی لئے حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ((اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ)) ''اعمال کی بنیاد نیتوں پر ہے''۔ نمائش اور دکھاوا اس بنیاد

005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq march05\ms24-02.inp 8/22/2014 4:08 PM PAGE 1 (1,1)

کو کھوکھلا کر کے رکھ دیتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ''لوگ قیامت کے دن صرف اپنی نیتوں پر اٹھائے جائیں گے''۔ (ابن ماجہ) یعنی آخرت میں انسان کا ظاہر نہیں دیکھا جائے گا' بلکہ صرف یہ دیکھا جائے گا کہ اس نے جو نیک کام کئے ہیں کس نیت سے کئے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ جہنم میں ایک ایسی وادی ہے جس سے خود جہنم بھی ہر دن چار سو بار پناہ مانگتی ہے۔ یہ وادی (گڑھا) محمد ﷺ کی اُمت کے ریاکاروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔ (ابن ماجہ' باب الریا)

اللہ تعالیٰ جب اپنے کسی بندے کو کوئی خوبی اور کمال عطا کرتا ہے تو وہ اس پر فخر کرنے لگتا ہے اور اپنے دل میں یہ سمجھنے لگتا ہے کہ یہ کمال اس کا اپنا پیدا کیا ہوا ہے۔ اس طرح اس میں خودنمائی کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے اور وہ اپنے سوا ہر شے کو پست وحقیر جاننے لگتا ہے۔ قومیں بھی جب خوشحال ہو جاتی ہیں' ان کے پاس دولت کی بہتات ہو جاتی ہے' وسائل زیادہ ہو جاتے ہیں اور افراد کی قوت میں اضافہ ہو جاتا ہے تو وہ طاقت وقوت کے غرور میں آپے سے باہر ہو جاتی ہیں۔ ایسے میں ان کی سرکشی اور خودنمائی ان کی تباہی کا باعث بن جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاد میں مسلمانوں کو حکم ہوا کہ وہ کبھی بھی طاقت کے غرور اور قوت کی نمائش میں مبتلا نہ ہوں بلکہ ان کی لڑائی کا مقصد حق کی حمایت اور اللہ کی خوشنودی ہو۔

اگر اچھا عمل کیا جائے اور نیت نمائش کی ہو تو وہ عمل اکارت یعنی ضائع ہو کر رہ جاتا ہے۔ حضور ﷺ کے زمانے میں منافقوں کا طرزِ عمل بھی ایسا ہی تھا' وہ اگر کچھ صدقہ خیرات کرتے تھے تو اس سے ان کا مقصد اپنی بڑائی ظاہر کرنا ہوتا تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ہدایت کی کہ:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ﴾ (البقرة:٢٦٤)

''اے ایمان والو! اپنے صدقات کو احسان جتا کر اور دکھ دے کر اس شخص کی طرح خاک میں نہ ملا دو جو اپنا مال محض لوگوں کو دکھانے کے لئے خرچ کرتا ہے اور نہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے نہ آخرت پر''۔

گویا اس کا یہ عمل یہ معنی رکھتا ہے کہ مخلوق ہی اس کے لئے سب کچھ ہے۔ اسی سے وہ اجر کی توقع رکھتا ہے۔ اسے ہرگز یہ یقین نہیں کہ ایک روز اعمال کا حساب ہوگا اور اللہ تعالیٰ ان کا

اجر عطا فرمائے گا۔ اسی طرح دکھاوے کی نماز پڑھنے والوں کے بارے میں فرمایا:

﴿فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ۝﴾ (الماعون)

''پھر تباہی ہے ان نماز پڑھنے والوں کے لئے جو اپنی نماز سے غفلت برتتے ہیں' جو ریاکاری کرتے ہیں۔''

منافقوں کی اس حالت کو دوسری جگہ اس طرح بیان فرمایا:

﴿وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝﴾ (النساء)

''اور جب وہ نماز کے لئے اٹھتے ہیں تو کسمساتے ہوئے اٹھتے ہیں' لوگوں کو دکھاتے ہیں اور اللہ کو کم ہی یاد کرتے ہیں۔''

معلوم ہوا کہ یہ منافق جو کچھ کرتے ہیں دوسروں کو دکھانے کے لئے کرتے ہیں تاکہ لوگ ان کی تعریف کریں' انہیں نیکوکار سمجھیں اور ان کی نیکی کا چرچا ہوتا رہے۔

بعض لوگوں کو اللہ علم کی روشنی عطا کرتا ہے۔ اس پر وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے اور اس کے حضور جھکنے کی بجائے غرور میں مبتلا ہونے لگتے ہیں اور اپنی بڑائی کا اظہار کرنے لگتے ہیں۔ قیامت کے دن ایسے عالم اور قاری کو اللہ کے حضور پیش کیا جائے گا اور پوچھا جائے گا کہ اس نے اس علم سے کیا کام لیا؟ وہ جواب میں کہے گا کہ اے اللہ! میں نے آپ کی خوشنودی کے لئے علم سیکھا' علم سکھایا اور قرآن پڑھا۔ جواب میں ارشاد ہوگا کہ جھوٹ کہتے ہو' تم نے علم اس لئے حاصل کیا کہ عالم کہے جاؤ' قرآن اس لئے پڑھا کہ قاری کہے جاؤ' اور وہ دنیا میں کہا جا چکا۔ پھر اسے گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ (مسلم شریف)

قرآن مجید کی آیات اور حضور اکرم ﷺ کی تعلیمات سے واضح ہوا کہ نمائش یعنی ریا اور دکھاوا اچھے اور نیک اعمال کو ضائع اور برباد کر دیتا ہے۔ ایسے میں نہ تو شہرت کے لئے جہاد کرنے والوں کو کوئی ثواب ملتا ہے اور نہ ان لوگوں کے لئے کوئی اجر ہے جو مال اس لئے خرچ کرتے ہیں کہ لوگ انہیں سخی اور فیاض کہیں۔ اس لئے ہم پر لازم ہے کہ ہم جو کام بھی کریں اللہ کی رضا اور خوشنودی کے لئے کریں۔

مسلمان کا طرزِ حیات (۴۱)

علامہ ابوبکر جابر الجزائری کی شہرۂ آفاق کتاب

"مِنهاجُ المسلم" کا اردو ترجمہ

مترجم : مولانا عطاء اللہ ساجد

کتاب العبادات

آٹھواں باب

نماز

۱) نماز کا حکم، حکمت اور فضیلت

(ا) نماز کا حکم

نماز ہر صاحب ایمان پر فرض ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مقدس کتاب قرآنِ مجید میں بہت سے مقامات پر اس کا حکم دیا ہے۔ مثلاً فرمانِ خداوندی ہے:

﴿فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتَابًا مَّوْقُوْتًا﴾

(النساء:۱۰۳)

''پس نماز قائم کرو۔ بے شک مؤمنوں پر نماز وقت پر ادا کرنا فرض ہے''۔

نیز ارشاد ہے:

﴿حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى﴾ (البقرۃ:۲۳۸)

''نمازوں کی حفاظت کرو اور (خاص طور پر) درمیانی نماز کی''

جناب رسول اللہ ﷺ نے اسے اسلام کی پانچ بنیادوں میں دوسرے نمبر پر ذکر فرمایا ہے۔ ارشاد ہے:

((بُنِيَ الْاِسْلَامُ عَلٰى خَمْسٍ : شَهَادَةِ اَنْ لَّا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا

رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلَاةِ وَاِيْتَاءِ الزَّكٰوةِ وَحَجِّ الْبَيْتِ وَصَوْمِ رَمَضَانَ))[1]

''اسلام پانچ چیزوں پر تعمیر کیا گیا ہے۔ یہ گواہی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ ادا کرنا اور بیت اللہ کا حج کرنا اور ماہِ رمضان کے روزے رکھنا۔''

شریعت کے حکم کے مطابق تارکِ نماز کو قتل کر دینا چاہئے۔ اور نماز میں سستی کرنے والا قطعی فاسق ہے۔

ب) نماز کی حکمت:

نماز کی فرضیت کی ایک اہم حکمت یہ ہے کہ اس سے نفس کا تزکیہ ہوتا ہے اور وہ پاک ہو جاتا ہے۔ اس کے ذریعے انسان دنیا میں اللہ سے مخاطب ہوتا ہے اور اسی کی وجہ سے آخرت میں نمازی کو اللہ سے ہم کلام ہونے کا شرف حاصل ہوگا۔ اس کے علاوہ نماز کی وجہ سے انسان کے اخلاق درست ہوتے ہیں اور وہ بے حیائی کے کاموں سے اور گناہوں سے بچ جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ﴾

(العنکبوت:٤٥)

''اور نماز قائم کرو۔ بے شک نماز بے حیائی اور بُرے کاموں سے روک دیتی ہے''۔

ج) نماز کی فضیلت

مندرجہ ذیل احادیث نبویہؐ سے نماز کی فضیلت اور عظمت خوب واضح ہو جائے گی۔

(۱) ارشادِ نبویؐ ہے:

((رَاْسُ الْاَمْرِ الْاِسْلَامُ وَعَمُوْدُهُ الصَّلَاةُ وَذِرْوَةُ سَنَامِهِ الْجِهَادُ))[2]

''(دین کے) کام کا سرا اسلام میں داخل ہونا ہے' اور اس کا ستون نماز ہے اور اس کی کوہان کی بلندی جہاد (فی سبیل اللہ) ہے۔''

(۲) آنحضور ﷺ نے فرمایا:

---

۱) صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب قول النبی ﷺ بنی الاسلام علی خمس وھو قول وفعل ویزید وینقص۔ وصحیح مسلم ' کتاب الایمان' باب بیان ارکان الاسلام ودعائمة العظام۔

۲) جامع الترمذی' ابواب الایمان' باب ما جاء فی حرمة الصلاة۔

((بَيْنَ الرَّجُلِ وَبَيْنَ الشِّرْكِ وَالْكُفْرِ تَرْكُ الصَّلَاةِ[1]))

''بندے اور شرک وکفر کے درمیان (فرق) ترکِ نماز ہے''۔ (یعنی نماز ترک کرنے سے وہ شرک اور کفر تک پہنچ جاتا ہے۔)

(۳) جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰى يَشْهَدُوْا اَنْ لَّا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَيُقِيْمُوا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ ، فَاِذَا فَعَلُوْا ذٰلِكَ عَصَمُوْا مِنِّىْ دِمَاءَ هُمْ وَاَمْوَالَهُمْ اِلَّا بِحَقِّ الْاِسْلَامِ وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللّٰهِ))[2]

''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ (کافر) لوگوں سے جنگ کروں حتیٰ کہ وہ یہ اقرار کرلیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ جب وہ یہ کام کریں گے تو مجھ سے اپنی جانیں اور اپنے مال محفوظ کرلیں گے مگر اسلام کے حق کے ساتھ[3]۔ اور ان کا حساب اللہ عزوجل کے ذمہ ہے۔''

(۴) آنحضرت ﷺ سے سوال کیا گیا: ''سب سے افضل کون سا عمل ہے؟'' ارشاد ہوا: ''نماز وقت پر قائم کرنا''۔[4]

(۵) ارشادِ نبویؐ ہے:

((مَثَلُ الصَّلَوَاتِ الْخَمْسِ كَمَثَلِ نَهْرٍ عَذْبٍ غَمْرٍ بِبَابِ اَحَدِكُمْ يَقْتَحِمُ فِيْهِ كُلَّ يَوْمٍ خَمْسَ مَرَّاتٍ فَمَا تَرَوْنَ ذٰلِكَ يُبْقِىْ مِنْ دَرَنِهٖ؟)) قَالُوْا لَا شَىْءَ ، قَالَ : ((فَاِنَّ الصَّلَوَاتِ الْخَمْسَ تُذْهِبُ الذُّنُوْبَ كَمَا يُذْهِبُ الْمَاءُ الدَّرَنَ))[5]

---

۱) صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان اطلاق اسم الکفر علی من ترك الصلاة۔

۲) صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب ﴿فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ﴾ و صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الامر بقتال الناس حتی یقولوا لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه۔

۳) مثلاً قتل عمد کے بدلے قاتل کی جان لینا یا زکوٰۃ وصول کرنا اسلام کا حق ہے۔ اس قسم کے حقوق کے علاوہ مسلمان کو قتل کرنا یا اس کا مال چھین لینا جائز نہیں۔

٤) صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان کون الایمان بالله افضل الاعمال۔

٥) صحیح مسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب المشی الی الصلاة تمحی به الخطایا وترفع به الدرجات۔ وصحیح البخاری، کتاب مواقیت الصلاة، باب الصلوات الخمس کفارة للخطایا (بالمعنٰی)

''پانچ نمازوں کی مثال ایسے ہے جیسے کسی کے دروازے پر میٹھے پانی والا دریا بہتا ہو' وہ اس میں پانچ بار داخل ہو (کر غسل کرے)' تمہارے خیال میں اس (کے جسم) پر کتنی میل کچیل باقی رہ جائے گی؟'' صحابہ کرام ﷺ نے عرض کیا: ''کچھ بھی نہیں''۔ فرمایا: ''پانچوں نمازیں گناہوں کو اس طرح زائل کر دیتی ہیں جس طرح پانی میل کچیل کو ختم کر دیتا ہے۔''

(۶) نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((مَا مِنِ امْرِئٍ مُسْلِمٍ تَحْضُرُهُ صَلَاةٌ مَكْتُوْبَةٌ فَيُحْسِنُ وُضُوْءَ هَا وَخُشُوْعَهَا وَرُكُوْعَهَا اِلَّا كَانَتْ كَفَّارَةً لِمَا قَبْلَهَا مِنَ الذُّنُوْبِ مَا لَمْ يُؤْتِ كَبِيْرَةً وَذٰلِكَ الدَّهْرَ كُلَّهٗ[۱]))

''جس مسلمان آدمی پر فرض نماز کا وقت آ جائے' وہ اچھی طرح وضو کرے اور اچھی طرح خشوع وخضوع اور رکوع (وسجدہ وغیرہ ارکان) ادا کرتے ہوئے نماز پڑھے تو یہ نماز اُس کے سابقہ گناہوں کا کفارہ بن جائے گی' جب تک کہ وہ کبیرہ گناہ کا ارتکاب نہ کرے (کیونکہ کبیرہ گناہ توبہ کے بغیر معاف نہیں ہوتا) یہ فضیلت (وضو اور نماز سے گناہوں کی معافی) ہمیشہ حاصل ہوتی رہتی ہے۔''

۲) نماز کی قسمیں: فرض' سنت اور نفل

ا) فرض:

دن رات میں پانچ نمازیں فرض ہیں' یعنی ظہر' عصر' مغرب' عشاء اور فجر۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((خَمْسُ صَلَوَاتٍ كَتَبَهُنَّ اللّٰهُ عَلَى الْعِبَادِ فَمَنْ جَاءَ بِهِنَّ' لَمْ يُضَيِّعْ مِنْهُنَّ شَيْئًا اسْتِخْفَافًا بِحَقِّهِنَّ كَانَ لَهٗ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدٌ اَنْ يُّدْخِلَهُ الْجَنَّةَ ' وَمَنْ لَّمْ يَاْتِ بِهِنَّ فَلَيْسَ لَهٗ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدٌ اِنْ شَآءَ عَذَّبَهٗ وَاِنْ شَآءَ اَدْخَلَهُ الْجَنَّةَ))[۲]

''پانچ نمازیں اللہ تعالیٰ نے بندوں پر فرض کی ہیں' جو انہیں ادا کرے گا اور اُن کے حق کو معمولی سمجھ کر ان میں سے کوئی نماز ضائع نہیں کرے گا' اس کے ساتھ اللہ کا وعدہ

---

۱) صحیح مسلم' کتاب الطهارة' باب فضل الوضوء والصلاة عقبه۔

۲) سنن ابی داوٗد' کتاب الصلاة' ابواب الوتر' باب فیمن لم یؤتر۔

ہے کہ اسے جنت میں داخل کرے گا۔ اور جو شخص یہ نمازیں (کما حقہ) ادا نہیں کرے گا اس سے اللہ کا کوئی وعدہ نہیں' اگر چاہے تو اسے عذاب دے' چاہے تو اسے جنت میں داخل کر دے''۔

ب) سنت:

سنت نمازیں مندرجہ ذیل ہیں: نماز وتر' فجر کی سنتیں' عیدین کی نمازیں' گرہن کی نماز' بارش مانگنے کی نماز' یہ سب سنت مؤکدہ ہیں۔ ☆

تحیۃ المسجد' فرض نمازوں سے پہلے اور پیچھے پڑھی جانے والی سنتیں' تحیۃ الوضوء' نماز ضحیٰ' نماز تراویح اور تہجد' یہ سنت غیر مؤکدہ ہیں۔

ج) نفل:

سنت مؤکدہ اور سنت غیر مؤکدہ کے علاوہ رات یا دن کو جو بھی نماز مطلقاً پڑھی جائے وہ نفل کہلاتی ہے۔

۳) نماز کی شرطیں

مندرجہ ذیل شرطیں پائی جائیں تو نماز واجب ہو جاتی ہے:

(۱) اسلام: یعنی کافر پر نمازیں فرض نہیں۔ نماز کا حکم اسی کے لئے ہے جو اللہ کی توحید اور محمد ﷺ کی رسالت پر ایمان رکھتا ہو۔ کیونکہ ارشاد نبویؐ ہے:

((اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰی یَشْهَدُوْا اَنْ لَّا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَیُقِیْمُوا الصَّلَاةَ وَیُؤْتُوا الزَّكَاةَ .....))[1]

''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ (کافر) لوگوں سے جنگ کروں حتیٰ کہ وہ یہ اقرار کریں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم کریں اور

☆ واضح رہے کہ احناف کے نزدیک نماز وتر اور عیدین کی نمازیں واجب ہیں' جبکہ فجر کی دو سنتیں' ظہر کے فرضوں سے قبل چار اور بعد میں دو سنتیں' مغرب کی دو سنتیں اور عشاء کی دو سنتیں مؤکدہ ہیں۔

۱) صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب ﴿فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِیْلَهُمْ﴾ و صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب الامر بقتال الناس حتی یقولوا: لا الہ الا اللّٰہ

زکوٰۃ ادا کریں۔''

آنحضرت ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا:

((فَادْعُهُمْ اِلٰی اَنْ یَّشْهَدُوْا اَنْ لَّا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ، فَاِنْ هُمْ اَطَاعُوْا لَکَ بِذٰلِکَ فَاَخْبِرْهُمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ فَرَضَ عَلَیْهِمْ خَمْسَ صَلَوَاتٍ فِیْ کُلِّ یَوْمٍ وَلَیْلَةٍ)) (۱)

''پس انہیں دعوت دے کہ وہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی گواہی دیں' اگر وہ تیری یہ بات مان لیں تو پھر انہیں بتانا کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر دن رات میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں۔''

(۲) عقل: دیوانے پر نماز فرض نہیں۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

((رُفِعَ الْقَلَمُ عَنْ ثَلَاثَةٍ : عَنِ النَّائِمِ حَتّٰی یَسْتَیْقِظَ وَعَنِ الصَّبِیِّ حَتّٰی یَحْتَلِمَ وَعَنِ الْمَجْنُوْنِ حَتّٰی یَعْقِلَ)) (۲)

''تین افراد سے قلم اٹھا لیا گیا ہے (یعنی وہ شرعی احکام کے مکلّف نہیں): سویا ہوا آدمی جب تک جاگ نہ جائے' اور بچہ جب تک بالغ نہ ہو جائے اور مجنون جب تک وہ (شفایاب ہو کر) سمجھ بوجھ کا مالک نہ ہو جائے۔''

(۳) بلوغ: بچے پر نماز فرض نہیں جب تک وہ بالغ نہ ہو جائے' کیونکہ مذکورہ بالا حدیث میں ہے: ''.....اور بچہ جب تک بالغ نہ ہو جائے''۔ البتہ اسے نماز کا حکم دیا جائے گا اور اس کے لئے نماز کی ادائیگی مستحب ہوگی۔ ارشاد نبویؐ ہے:

((مُرُوْا اَوْلَادَکُمْ بِالصَّلَاةِ وَهُمْ اَبْنَاءُ سَبْعِ سِنِیْنَ وَاضْرِبُوْهُمْ عَلَیْهَا وَهُمْ اَبْنَاءُ عَشْرٍ وَفَرِّقُوْا بَیْنَهُمْ فِی الْمَضَاجِعِ)) (۳)

---

۱) صحیح البخاری' کتاب الزکاۃ' باب اخذ الصدقة من الاغنیاء وترد فی الفقراء حیث کانوا۔

۲) سنن ابی داوٗد' کتاب الحدود' باب فی المجنون یسرق او یصیب حدًا۔ (اس کی سند منقطع ہے)۔ مستدرك حاکم' کتاب الحدود' باب ذکر من رفع عنه القلم۔ امام حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ صحیح بخاری کی ایک حدیث سے بھی اس مسئلہ کی تائید ہوتی ہے۔ دیکھئے صحیح البخاری' کتاب المحاربین' باب لا یرجم المجنون والمجنونة۔

۳) سنن ابی داوٗد' کتاب الصلاۃ' باب متی یؤمر الصبی بالصلاۃ۔

''اپنے بچوں کو نماز کا حکم دو جب وہ سات سال کے ہو جائیں' اور انہیں (نماز کے ترک کرنے پر) سزا دو جب وہ دس سال کے ہو جائیں' اور انہیں الگ الگ بستروں میں سلاؤ۔''

(۴) وقت کا شروع ہو جانا: فرض نماز اُس کا وقت شروع ہو جانے سے پہلے واجب نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتَابًا مَّوْقُوْتًا﴾ (النساء)

''بے شک نماز مسلمانوں پر مقرر اوقات میں ادا کرنا لکھا گیا ہے۔''

حدیث میں ہے کہ جبریل علیہ السلام نبی اکرم ﷺ کو نماز کے اوقات میں تعلیم دینے کے لئے تشریف لائے اور فرمایا: ''اٹھئے اور نماز ادا کیجئے''۔ تو ظہر کی نماز اس وقت ادا کی جب سورج ڈھل گیا۔ پھر عصر کے وقت تشریف لائے اور فرمایا: ''اٹھئے اور نماز ادا کیجئے''۔ تو آنحضرت ﷺ نے عصر کی نماز ادا کی جب کہ ہر چیز کا سایہ اس کے برابر ہو گیا تھا۔ پھر مغرب کے وقت تشریف لائے اور فرمایا: ''اٹھئے اور نماز ادا کیجئے''۔ تو آنحضرت ﷺ نے مغرب کی نماز ادا کی جب سورج غروب ہو گیا تھا۔ پھر عشاء کے وقت تشریف لائے اور فرمایا: ''اٹھئے اور نماز ادا کیجئے''۔ چنانچہ حضور ﷺ نے عشاء کی نماز ادا کی جب شفق غائب ہو گئی تھی۔ پھر فجر کے وقت صبح صادق ہوتے ہی تشریف لائے۔ اگلے دن حضرت جبریل علیہ السلام ظہر کے وقت تشریف لائے اور حضور ﷺ سے فرمایا: ''اٹھئے اور نماز ادا کیجئے''۔ اور حضور ﷺ نے نماز ادا کی جبکہ ہر چیز کا سایہ اس کے برابر ہو گیا تھا۔ پھر عصر کے وقت تشریف لائے اور فرمایا: ''اٹھئے اور نماز ادا کیجئے''۔ تو آپ ﷺ نے نماز پڑھی جب ہر چیز کا سایہ اس سے دُگنا ہو گیا تھا۔ پھر مغرب کے وقت تشریف لائے' ایک ہی وقت میں' اس کے وقت میں تبدیلی نہیں کی۔ پھر عشاء کے وقت تشریف لائے جب آدھی یا تہائی رات گزر چکی تھی تو حضور ﷺ نے عشاء کی نماز ادا کی۔ پھر (صبح کو) تشریف لائے جب خوب روشنی ہو گئی تھی اور فرمایا: ''اٹھئے اور نماز پڑھئے''۔ تو حضور ﷺ نے فجر کی نماز پڑھی۔ پھر فرمایا: ''ان دونوں (وقتوں) کے درمیان وقت ہے''۔ (۱)

(۵) عورت کا حیض و نفاس کے خون سے پاک ہونا: حیض و نفاس کے دوران

---

۱) مسند احمد۔ و سنن النسائی' کتاب المواقیت' باب اوّل وقت العشاء (نحوہ) و جامع الترمذی' ابواب الصلاۃ' باب ما جاء فی مواقیت الصلاۃ۔

عورت پر نماز فرض نہیں ہوتی حتیٰ کہ وہ پاک ہو جائے۔ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

((فَإِذَا اَقْبَلَتِ الْحَيْضَةُ فَاتْرُكِي الصَّلاَةَ)) (۱)

''جب حیض شروع ہو تو نماز چھوڑ دے۔''

ب) صحت نماز کی شرطیں:

مندرجہ ذیل شرطیں پائی جائیں تو نماز صحیح ہوتی ہے:

(۱) طہارت: یعنی نمازی ظاہری نجاست سے بھی پاک ہو' اس کے بدن یا لباس پر نجاست نہ لگی ہو اور جس جگہ وہ نماز ادا کرتا ہے وہ بھی پاک ہو۔ پھر نجاستِ حکمی یعنی حدثِ اصغر سے بھی وضو کر کے پاک ہو گیا ہو اور حدثِ اکبر سے پاک ہونے کے لئے غسل کر لیا ہو۔

(۲) ستر عورت: یعنی جسم کے ضروری حصوں کو لباس کے ذریعے چھپانا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿خُذُوا زِينَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ .....﴾ (الاعراف: ۳۱)

''ہر نماز کے وقت اپنی آرائش اختیار کرو۔''

یہاں زینت سے مراد وہ لباس ہے جس سے اعضائے ستر کو چھپایا جاتا ہے۔ اس لئے جس انسان کا ستر کھلا ہو گا اس کی نماز نہیں ہو گی۔

مرد کے لئے اعضائے ستر کی حدود ناف سے گھٹنے تک ہیں۔ عورت کا پورا جسم ستر ہے سوائے چہرے اور ہاتھوں کے۔ ارشاد نبویؐ ہے:

((لَا يَقْبَلُ اللّٰهُ صَلَاةَ حَائِضٍ اِلَّا بِخِمَارٍ)) (۲)

''اللہ تعالیٰ بالغ عورت کی نماز جو اوڑھنی کے بغیر پڑھی گئی ہو' قبول نہیں فرماتا۔''

نبی کریم ﷺ سے سوال کیا گیا کہ اگر عورت صرف قمیص اور دوپٹہ اوڑھ کر نماز پڑھ لے اور اس نے تہبند نہ پہنا ہو تو کیا حکم ہے؟ تو آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

---

۱) صحيح البخاری' كتاب الحيض' باب الاستحاضة۔ وصحيح مسلم' كتاب الحيض' باب المستحاضة وغسلها وصلاتها (نحوه)۔

۲) سنن ابی داؤد' كتاب الصلاة' باب المرأة تصلی بعير خمار۔ وجامع الترمذی' كتاب الصلاة' باب لا تقبل صلاة المرأة الا بخمار۔ امام ترمذیؒ نے اسے حسن کہا ہے۔

((اِذَا كَانَ الدِّرْعُ سَابِغًا يُغَطِّيْ ظُهُوْرَ قَدَمَيْهَا))(۱)

''جب قمیص لمبی ہو' عورت کے پاؤں کی پشت کو چھپا رہی ہو (تو نماز درست ہے)''۔

(۳) قبلہ کی طرف منہ کرنا : اس کے بغیر نماز درست نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ .....﴾(البقرة: ۱۵۰)

''اور تم جہاں کہیں بھی ہو اپنے چہرے اسی (مسجد حرام) کی طرف کر لیا کرو۔''

البتہ کسی شخص کو کوئی عذر لاحق ہو' مثلاً خوف یا مرض وغیرہ' تو اس عذر کی وجہ سے اس کے ذمہ سے یہ فرض ساقط ہو جائے گا۔ اسی طرح مسافر اپنی سواری کی پشت پر بیٹھ کر نفل نماز ادا کرنا چاہے تو جس طرف سواری چل رہی ہو اُدھر ہی مُنہ کئے ہوئے نماز ادا کر سکتا ہے۔ کیونکہ جناب رسول اللہ ﷺ مکہ سے مدینہ آ رہے تھے۔ (راستے میں) حضور ﷺ اپنی سواری پر نماز ادا کر لیتے تھے جدھر بھی سواری کا مُنہ ہوتا''۔(۲)

---

۱) سنن ابی داوٗد' کتاب الصلاۃ' باب فی کم تصلی المرأۃ۔ ومستدرك حاکم' کتاب الصلاۃ' باب لا تقبل صلاۃ حائض الا بخمار۔ امام حاکم نے اسے صحیح کہا ہے۔

۲) صحیح مسلم' کتاب صلاۃ المسافرین وقصرہ' باب جواز صلاۃ النافلۃ علی الدابۃ فی السفر حیث توجھت۔

گوشہ تاریخ

علامہ اقبال اور مولانا آزاد کے باہمی روابط

پرانے کاغذات میں سے یہ مسودہ برآمد ہوا ہے' نمعلوم کیسے کمپوز ہونے کے باوجود اشاعت سے رہ گیا۔ اب یہ اہم تحریر ہدیۂ قارئین ہے۔ صاحب مضمون کی نظر سے گزرے تو ہمیں اپنے نام سے مطلع فرمادیں تاکہ پس نوشت ہی کی حیثیت سے شائع کردیا جائے۔ (ادارہ)

اب مولانا آزاد اور علامہ اقبال کے بارے میں چند باتیں عرض کی جاتی ہیں:

بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ مولانا آزاد اور علامہ اقبال کی کبھی باہم ملاقات نہیں ہوئی۔ وہ یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ مولانا بے شمار شعراء کے اشعار اپنی مختلف کتابوں میں درج کرتے ہیں لیکن اقبال کا کوئی شعر درج نہیں کرتے۔ مندرجہ ذیل سطور میں اس قسم کے تمام اعتراضات رفع ہوجائیں گے اور صحیح صورت حال واضح ہوکر سامنے آجائے گی۔

لاہور میں میاں عبدالعزیز مالواڈہ (بار ایٹ لاء) کی کوٹھی (بیرون یکی دروازہ) کو کسی زمانے میں برصغیر کے سیاسی رہنماؤں کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ مختلف اوقات میں اس میں قائداعظم' مولانا آزاد' گاندھی جی' مولانا محمد علی جوہر' مولانا شوکت علی' ڈاکٹر مختار احمد انصاری' مولانا انور شاہ کاشمیری' سید عطاء اللہ شاہ بخاری' حکیم اجمل خان' موتی لال نہرو اور جواہر لال نہرو وغیرہ کئی دفعہ تشریف لائے۔ علامہ اقبال تو لاہور سے تعلق رکھتے تھے اور کہنا چاہئے کہ میاں صاحب کا گھران کا اپنا گھر تھا۔

اب یہ کوٹھی منہدم ہوچکی ہے اور اس کی جگہ مالواڈہ کمپلیکس تعمیر کیا جاچکا ہے جبکہ اس کے مکین چھاؤنی میں اسد جان روڈ پر منتقل ہو گئے ہیں۔ جب یہ حضرات اس کوٹھی میں مقیم تھے' میاں عبدالعزیز مرحوم کے صاحبزادے میاں عبدالمجید مرحوم بعض کمروں میں لے جاکر باقاعدہ ماہ وسال اور وقت کا تعین کرکے بتایا کرتے تھے کہ مولانا ابوالکلام آزاد آئے تو ان

سے ملاقات کے لئے علامہ اقبال اور فلاں فلاں حضرات تشریف لائے۔ مولانا یہاں بیٹھے تھے' علامہ اقبال یہاں تشریف فرما تھے اور فلاں فلاں بزرگ اس صوفے یا اس قالین پر اس انداز سے بیٹھے تھے اور فلاں مسئلے پر اس اسلوب میں بحث ہوئی تھی۔ وہ سب کے محلِ جلوس اور جائے قیام کی نشان دہی کیا کرتے تھے اور موضوعِ گفتگو کی تفصیلات بھی بیان فرمایا کرتے تھے۔ یہ ایک تاریخی کوٹھی تھی اور اس میں بہت سے ہندو مسلم اکابر کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔

۱) علامہ اقبال اور مولانا آزاد کے درمیان بقول میاں عبدالمجید' نہایت خوشگوار طریقے سے مختلف مسائل پر سلسلہ کلام جاری رہتا تھا۔ میاں صاحب کا بیان ہے کہ ان حضرات کی گفتگو سب لوگ انتہائی غور و فکر اور توجہ سے سنتے اور اس سے استفادہ کرتے تھے۔

۲) ان دونوں حضرات کے مراسم و تعلقات کی نزاکت اور گہرائی کا اس حقیقت سے بھی پتہ چلتا ہے کہ جہاں یہ علوم و فنون کے مختلف گوشوں میں مہارت رکھتے ہیں' وہاں ملکی سیاست کے نشیب و فراز سے بھی دونوں کو گہرا تعلق ہے اور پھر دونوں ذہنی اور علمی طور پر سیاست کے الگ الگ کیمپوں سے وابستہ ہیں۔ دونوں کا دور سیاست کا بھرپور دور ہے' لیکن نہ کبھی علامہ نے کسی سیاسی معاملے میں مولانا کے خلاف کوئی بیان دیا اور نہ کبھی مولانا نے علامہ کے کسی سیاسی نقطہ نظر کو محلِ تنقید ٹھہرایا۔ اس زمانے کا تمام سیاسی ریکارڈ دیکھ لیجئے' ایک دوسرے کی مخالفت میں دونوں کی کوئی تحریر نہیں ملے گی۔ یہ ان کے پُرخلوص باہمی روابط کی بہت بڑی دلیل ہے اور اس سے واضح ہوتا ہے کہ دونوں بزرگ ایک دوسرے سے انتہائی تکریم کا برتاؤ کرتے تھے۔

۳) ماہنامہ ''خدنگ نظر'' منشی نوبت رائے نظر کا رسالہ تھا جو لکھنؤ سے نکلتا تھا۔ ۱۹۰۳ء میں مولانا چند مہینے اس کے حصہ مضامین کے اسسٹنٹ ایڈیٹر رہے۔ ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری ''مولانا ابوالکلام آزاد کی صحافت'' میں (بحوالہ: ''ہماری زبان'' علی گڑھ' یکم نومبر ۱۹۶۹ء) لکھتے ہیں کہ ''خدنگ نظر'' کے مارچ ۱۹۰۳ء کے شمارے میں ''عرض حال'' کے عنوان سے اس کے مہتمم نے لکھا:

> ''ہم نے اپنی کوششوں میں اپنے دلی دوست ابوالکلام مولوی محی الدین صاحب آزاد دہلوی کو بھی شریک کر لیا ہے' جن کے اکثر مضامین خدنگ نظر اور دوسرے معزز اردو جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ آئندہ سے وہ ''خدنگ نظر'' کے حصہ مضامین کے

لئے اسسٹنٹ ایڈیٹر کے فرائض ادا کریں گے جو انہوں نے بخوشی قبول فرمائے ہیں۔''

اُس وقت مولانا عمر کے پندرھویں سال میں تھے۔ ایک روایت کے مطابق علامہ اقبال کے بارے میں پہلا تعارفی مضمون اسی رسالے میں شائع ہوا تھا۔

۴) اپریل ۱۹۰۵ء میں جب مولانا انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں تشریف لائے' اس وقت وہ ''لسان الصدق'' کے ایڈیٹر تھے اور عمر ابھی سترہ سال کی نہیں ہوئی تھی۔ ان کی تقریر سے لوگ نہایت متاثر ہوئے تھے۔ علامہ اقبال سے اوّلین ملاقات اسی موقع پر ہوئی تھی۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی اپنی کتاب ''آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی'' میں رقم طراز ہیں:

> ''اس زمانے میں ڈاکٹر اقبال کی شاعری کو ''مخزن'' نے نیا نیا ملک کے سامنے پیش کیا تھا' لیکن بہت جلد ہی لوگوں میں غیر معمولی شہرت ہوگئی تھی۔ انجمن میں ان کی نظم خوانی خاص طور پر شوق و ذوق سے سنی جاتی تھی۔ ان سے بھی پہلی مرتبہ اس سفر میں ملاقات ہوئی۔''

۵) مولانا نے ''الہلال'' جاری کیا تو علامہ اقبال نے اس میں پوری پوری دلچسپی لی اور اس کا حلقہ اشاعت بڑھانے کے لئے تگ و دو کی۔ چنانچہ ۹/اکتوبر ۱۹۱۲ء کے ''الہلال'' کے صفحہ اوّل پر مولانا نے مندرجہ ذیل نوٹ تحریر فرمایا:

> ''الہلال کی توسیع اشاعت کے لئے ابتدا سے بغیر کسی تحریک اور طلب کے جو احباب سعی فرما رہے ہیں' دفتر ان کا شکر گزار ہے۔ ایسے حضرات تو بکثرت ہیں جنہوں نے ایک ایک دو دو خریدار بہم پہنچائے' مگر جن احباب نے خاص طور پر اس بارے میں سعی کی ہے' ان کے اسمائے گرامی شکریئے کے ساتھ درج ذیل ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا فضل یہ ہے کہ وہ اپنے کسی بندے کو مخلص اور بغیر منت و طلب احسان کرنے والے احباب عطا فرمائے۔''

اس فہرست میں جن چودہ حضرات کے نام درج ہیں' ان میں سے کسی نے سات' کسی نے آٹھ' کسی نے چار اور کسی نے چھ خریدار بہم پہنچائے' مگر مولانا فرماتے ہیں: ''دہلی کے ایک بزرگ نے جنہوں نے اپنا نام ہم پر بھی ظاہر نہیں کیا بارہ' جناب شیخ محمد اقبال صاحب بیرسٹرایٹ لاء (لاہور) نے دس اور جناب مولانا سید عبدالحق صاحب بغدادی نائب پروفیسر عربی محمڈن کالج علی گڑھ نے دس خریدار (بہم پہنچائے)''۔

۶) ''جوابِ شکوہ'' اقبال کی مشہور نظم ہے۔ اس کی تائید میں (سابق) ریاست رام پور

(یوپی) کے ہوم سیکرٹری جناب صاحب زادہ مصطفیٰ خان شرر کی نظم ۲۶ر فروری ۱۹۱۳ء کے ''الہلال'' کے بہرۂ ادبیات میں ''جوابِ شکوہ کا اقبال'' کے عنوان سے چھپی۔ یہ نظم ''الہلال'' کے دو صفحات (۱۲، ۱۳) پر مشتمل ہے۔ یہ نہایت شاندار اور طویل نظم ہے۔

۷) قاضی افضل حق قرشی نے اپنی کتاب ''اقبال کے ممدوح علماء'' میں شمشیر قلم کی اشاعت ۲۷ر فروری ۱۹۱۴ء کے صفحہ ۲ سے مندرجہ ذیل اقتباس درج کیا ہے:

''۱۹ر فروری ۱۹۱۴ء کو مولانا آزاد انجمن ہلال احمر قسطنطنیہ کے وفد کے ساتھ لاہور آئے اور اقبال سے بھی ملاقات ہوئی۔ یہ وفد مسلمانانِ ہند کا شکریہ ادا کرنے کے لئے ہندوستان آیا تھا۔ ریلوے اسٹیشن پر وفد کا پُر جوش استقبال کیا گیا۔ شام چار بجے باغ بیرون موچی دروازہ میں جلسہ عام منعقد ہوا۔ ارکانِ وفد اور مولانا آزاد جب جلسہ گاہ میں آئے تو حاضرین جلسہ کی طرف سے ان کے گلے میں ہار ڈالے گئے اور بے شمار پھول برسائے گئے۔ اس کے بعد حاجی شمس الدین سیکرٹری انجمن حمایت اسلام لاہور نے نواب ذوالفقار علی خاں رئیس مالیر کوٹلہ وسابق وزیر اعظم ریاست پٹیالہ کے صدر جلسہ بنائے جانے کی تجویز پیش کی جو اقبال کی تائید سے منظور ہوئی۔ نواب ذوالفقار علی خاں نے افتتاحی تقریر کی۔ ان کے بعد ڈاکٹر عدنان بے اور عمر کمال بے نے ترکی میں تقاریر کیں، جن کا ترجمہ علامہ توفیق بے ایڈیٹر رسالہ ''سبیل الرشاد'' قسطنطنیہ نے فارسی میں سنایا۔ ان کے بعد چوہدری غلام حیدر خاں اسسٹنٹ ایڈیٹر ''زمیندار'' اور حاجی شمس الدین نے تقاریر کیں۔ مولانا آزاد وفد کے ہمراہ اسی شام واپس چلے گئے کہ دوسرے دن دہلی میں بھی جلسہ ہو رہا تھا۔ اقبال اور نواب ذوالفقار علی خاں نے مولانا آزاد پر زور دیا کہ مزید ایک روز لاہور میں قیام فرمائیں۔''

۸) ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء کے ''الہلال'' میں ''الہلال پریس کی ضمانت طلبی'' کے عنوان سے سب ایڈیٹر کی طرف سے حسب ذیل اعلان شائع ہوا:

''بنگال گورنمنٹ نے ۱۶ر نومبر ۱۹۱۴ء کو ''الہلال'' پریس کی دو ہزار کی پہلی ضمانت ضبط کر لی اور ''الہلال'' کے دو نمبر مورخہ ۱۴ و ۲۱ اکتوبر ۱۹۱۴ء بھی جو مشتر کہ صورت میں ایک ساتھ شائع ہوئے تھے، ضبطی میں آئے۔ بنگال گورنمنٹ نے جن مضامین کو قابل اعتراض قرار دیا وہ ''حدیث الجنود'' اور ''سقوط انٹورپ'' ہیں۔ ایک بلجیم تصویر بھی قابل اعتراض قرار دی گئی ہے، جس کے نیچے قرآن حکیم کی یہ آیت درج ہے: ﴿وَمَا

ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ كَانُوْا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ﴾ مولانا اس وقت کلکتہ سے باہر دورے پر تھے۔ ضبطی اور خانہ تلاشی کا وارنٹ ان کی عدم موجودگی میں آیا تھا۔ دفتر کی طرف سے ان کو اس واقعہ کی اطلاع دی گئی تو انہوں نے بذریعہ تار ہدایت فرمائی کہ جو نمبر چھپ رہا ہے' اسے فوراً شائع کر دو اور ایک مختصر نوٹ میں ضبطی کی اطلاع کے ساتھ یہ اعلان کر دو کہ ہم اپنی ذات سے آخر تک ''الہلال'' جاری رکھنا چاہتے ہیں اور ان شاء اللہ العزیز جاری رکھیں گے۔ اس لئے ہم حسب ہدایت یہ شمارہ شائع کر رہے ہیں اور اس کی آئندہ زندگی کی قارئین کرام کو کامل توقع دلاتے ہیں۔ ﴿وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖ اِلَّا الضَّالُّوْنَ﴾۔''

یہاں یہ یاد رہے کہ اُس زمانے میں دو ہزار کی ضمانت ضبط کر لینے کے بعد دس ہزار کی ضمانت طلب کی جاتی تھی۔ اس قانون کے مطابق الہلال پریس کی دو ہزار کی ضبطیٔ ضمانت کے بعد دس ہزار کی ضمانت کا مطالبہ کیا گیا تھا۔

اس کے بعد ایک سال اخبار بند رہا۔ پھر ہفت روزہ ''البلاغ'' جاری کیا گیا۔ اس کا پہلا شمارہ ۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء (۴ محرم ۱۳۳۴ھ) کو شائع ہوا۔ اس کے صفحہ اوّل پر ''ادبیات'' کے تحت علامہ اقبال کی مشہور نظم شائع کی گئی جو بانگِ درا میں ''عرفی'' کے عنوان سے چھپی تھی:

محل ایسا کیا تعمیر عرفؔی کے تخیل نے
تصدق جس پہ حیرت خانۂ سیناؔ و فاراؔبی

آخری شعر ہے:

صدا تربت سے آئی ''شکوۂ اہلِ جہاں کم گو
نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی
حدی را تیز تر می خواں چوں محمل را گراں بینی''

مولانا نے ''البلاغ'' میں اس نظم کا عنوان عرفی کے مصرع اوّل کو بنایا ہے:

نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی!

اقبال کی یہ نظم مولانا نے ''البلاغ'' کے پہلے شمارے کے پہلے صفحے پر شائع کی۔ اقبال کے علاوہ کسی کی نظم الہلال یا البلاغ کے صفحہ اوّل پر کبھی جگہ نہیں پا سکی۔ ''الہلال'' میں علامہ شبلی کی نظمیں بھی شائع ہوتی رہی ہیں' لیکن صفحہ اوّل پر نہیں بلکہ اندر کے صفحات پر! صفحہ اوّل پر اشاعت کا اعزاز صرف اقبال کے کلام کو حاصل ہوا۔

۹) علامہ کی کتاب ''رموزِ بےخودی'' ۱۹۱۸ء میں چھپی تھی۔ اُس وقت مولانا رانچی میں نظر بند تھے۔ اقبال نے یہ کتاب انہیں وہیں بھجوائی۔ مولانا نے کتاب وصول فرمائی اور انہیں بذریعہ خط اس کی اطلاع دی۔ اس کا ذکر اقبال ۲۸/اپریل ۱۹۱۸ء کے ایک خط میں کرتے ہیں جو انہوں نے سید سلیمان ندوی کو ارسال فرمایا:

> ''والا نامہ ابھی ملا ہے۔ رموزِ بےخودی میں نے ہی آپ کی خدمت میں بھجوائی تھی۔ ریویو کے لئے سراپا سپاس ہوں۔
> آج مولانا ابوالکلام کا خط آیا ہے۔ انہوں نے میری اس ناچیز کوشش کو بہت پسند فرمایا ہے۔''

یہ خط ''اقبال نامہ: حصہ اوّل'' میں مندرج ہے۔

۱۰) مولانا آزاد کا ذکر کسی نہ کسی اسلوب میں اقبال نے مختلف مکتوبات میں کیا ہے۔

مولانا کی تصنیفات میں ''تذکرہ'' خاص اہمیت کی تصنیف ہے جو رانچی کی نظر بندی (۳۰/مارچ ۱۹۱۶ء تا یکم جنوری ۱۹۲۰ء) کے زمانے کی نہایت دلچسپ علمی یادگار ہے۔ یہ کتاب جون ۱۹۱۶ء سے ۱۷/اکتوبر ۱۹۱۶ء تک پانچ مہینے میں قلم بند ہوئی۔ مقدمۂ کتاب میں اس کے ناشر مرزا فضل الدین احمد ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر اقبال کا مذہبی عقائد پر پچھلا حال جو کچھ سنا ہے' اس کے مقابلے میں اب ان کی فارسی مثنویاں دیکھتے ہیں تو سخت حیرت ہوتی ہے۔ ''اسرارِ خودی'' اور ''رموزِ بےخودی'' ''فی الحقیقت ''الہلال'' کی صدائے بازگشت ہیں۔''

اس سلسلے میں علامہ اقبال نے ۱۰/نومبر ۱۹۱۹ء کو سید سلیمان ندوی کے نام خط لکھا۔ ملاحظہ فرمائیے:

> ''مولانا ابوالکلام آزاد کا ''تذکرہ'' آپ کی نظر سے گزرا ہوگا' بہت دلچسپ کتاب ہے' مگر دیباچے میں مولوی فضل الدین احمد مرزا لکھتے ہیں: ''اقبال کی مثنویاں الہلال کی صدائے بازگشت ہیں''۔ شاید ان کو یہ معلوم نہیں کہ جو خیالات میں نے ان مثنویوں میں ظاہر کئے ہیں' ان کو برابر ۱۹۰۷ء سے ظاہر کر رہا ہوں۔ اس کے شواہد میری مطبوعہ تحریروں ـــــ نظم و نثر ـــــ اردو و انگریزی میں موجود ہیں' جو غالباً مولوی صاحب کے پیش نظر نہ تھیں۔ بہرحال اس کا کچھ افسوس نہیں کہ انہوں نے ایسا لکھا' مقصود اسلامی حقائق کی اشاعت ہے' نہ نام آوری۔ البتہ اس بات کا رنج ہوا کہ

ان کے خیال میں اقبال تحریک الہلال سے پہلے مسلمان نہ تھا' تحریک الہلال نے اسے مسلمان کر دیا۔ ان کی عبارت سے ایسا خیال مترشح ہوتا ہے۔ ممکن ہے ان کا مقصود یہ نہ ہو—— میرے دل میں مولانا ابوالکلام آزاد کی بڑی عزت ہے اور ان کی تحریک سے ہمدردی' مگر کسی تحریک کی وقعت بڑھانے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ اوروں کی دل آزاری کی جائے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اقبال کے جو مذہبی خیالات اس سے پہلے سنے گئے' ان میں اور مثنویوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ معلوم نہیں انہوں نے کیا سنا' اور سنی سنائی بات پر اعتماد کر کے ایسا جملہ لکھنا جس کے کئی معنی ہو سکتے ہیں' کسی طرح ان لوگوں کے شایانِ شان نہیں جو اصلاح کے علمبردار ہوں۔ مجھے معلوم نہیں' مولوی فضل الدین صاحب کہاں ہیں' ورنہ یہ مؤخر الذکر شکایت براہِ راست ان سے کرتا۔ اگر آپ کی ان سے ملاقات ہو تو میری شکایت ان تک پہنچا دیجئے۔''

اگرچہ مولانا کو مرزا فضل الدین احمد کی رائے اور تحریر کا ذمہ دار نہیں قرار دیا جا سکتا' تاہم جب سید سلیمان صاحب نے ڈاکٹر صاحب کے اس خط کی طرف انہیں توجہ دلائی تو انہوں نے واضح الفاظ میں لکھا:

''ڈاکٹر اقبال کا شکوہ بے جا نہیں۔ یہ نہایت ہی لغو اور سبک بات ہے کہ فلاں نے فلاں بات فلاں کے اثر سے لکھی اور فلاں کے خیال میں یوں تبدیلی ہوئی' لیکن لوگوں کا پیمانہ نظر یہی باتیں ہیں' تو کیا کیا جائے؟ دراصل اس ''تذکرہ'' کی ساری باتیں میرے لئے تکلیف دہ ہوئیں۔ مسٹر فضل دین نے یہ مقدمہ لکھ کر نظر ثانی کے لئے بھیجا تھا' اس لئے کہ وہ موجودہ حالت میں کتاب کو پہلا حصہ کر کے شائع کرنا چاہتے تھے اور میں مصر تھا کہ ایک ہی مرتبہ میں پوری کتاب شائع کر دی جائے' صرف اتنا ٹکڑا حد درجہ ضمنی مطولات و عدم انضباط کی وجہ سے نہایت مکروہ ہوگا۔ خیال کیا کہ مقدمے کا واپس نہ کرنا اشاعت میں روک ہوگا' لیکن انہوں نے بجنسہٖ چھاپ کر' جلد باندھ کر یکا یک ایک نسخہ بھیج دیا اور ان ساری باتوں کو وہ مزاح سمجھتے رہے۔ علاوہ ڈاکٹر اقبال وغیرہ کے ٹکڑے کے' پورا مقدمہ طرز و تحریر و استدلال وغیرہ کے لحاظ سے بھی بالکل لغو ہے۔ لطف یہ کہ اس مرتبہ وہ جلسے کے موقع پر آئے اور میں نے پوچھا کہ اقبال کی نسبت آپ نے کیونکر تبدیلی معلوم کی تو خود میرے ہی قول کا حوالہ دیا جو کبھی کہا تھا۔ حالانکہ میں نے جو بات کہی تھی' وہ صرف یہ تھی کہ اقبال پہلے آج کل کے عامۃ الناس کے تصوف میں مبتلا تھے' اب ان کے خیالات اس طرف سے ہٹ گئے اور وہ دونوں

مثنویوں میں جو بات ظاہر کرنی چاہتے ہیں' وہ وہی ہے جو میں ہمیشہ لکھتا رہا ہوں۔''

مولانا کا یہ خط ۲ رجنوری ۱۹۲۰ء کا تحریر کردہ ہے اور اپنے مفہوم میں بالکل واضح ہے۔ سید صاحب نے اس کی اطلاع یقیناً ڈاکٹر صاحب کو دی ہوگی اور وہ مطمئن ہو گئے ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد انہوں نے اس ضمن میں کوئی بات نہیں کی۔

۱۱) ''اقبال نامہ: حصہ اوّل'' (مرتبہ شیخ عطاء اللہ) میں سید سلیمان ندوی کے نام علامہ کا ایک خط درج ہے' جس میں مولانا آزاد کی رانچی سے رہائی پر مسرت کا اظہار کیا گیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''الحمدللہ مولانا آزاد کو رہائی ملی.....

مولانا آزاد اب کہاں ہیں؟ پتہ لکھئے' ان کی خدمت میں عریضہ لکھوں۔''

مولانا یکم جنوری ۱۹۲۰ء کو رہا ہوئے تھے۔ علامہ کا یہ مکتوب گرامی انہی دنوں کا ہے۔

۱۲) ڈاکٹر شیر بہادر خاں پنی کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جو مولانا سے انتہائی عقیدت مندانہ تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے ''مولانا ابوالکلام آزاد: ایک تشخصی مطالعہ'' کے نام سے کتاب لکھی جو بہت سی معلومات پر محتوی ہے۔ اس کتاب کے صفحہ ۱۸ پر ''میاں عبدالعزیز کی کوٹھی پر ملاقات'' کے عنوان کے تحت وہ رقم فرماتے ہیں:

''مولانا جب کبھی لاہور تشریف لاتے تو عموماً میاں عبدالعزیز بیرسٹر کی کوٹھی میں ٹھہرا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ مجھے ان کی آمد کا علم ہوا تو میں اپنے ایک ہم سبق دوست ڈاکٹر محمد شاہ مرحوم ساکن ڈیرہ اسماعیل خاں کے ساتھ کوٹھی پر پہنچ گیا۔ اس دن انہوں نے چند اکابر لاہور کو خطاب کرنے کے لئے مدعو کیا تھا۔ فرشی نشست تھی۔ بہت سے اکابر موجود تھے۔ علامہ اقبال مرحوم مولانا کے بالکل سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم بھی اس محفل میں گھس کر بیٹھ گئے۔ مولانا کے ہاتھ میں کاغذ کی ایک سلپ تھی' جس پر تقریر کے پوائنٹ لکھے ہوئے تھے۔ موضوع تو اب یاد نہیں رہا' البتہ یہ بات ذہن پر نقش ہے کہ تقریر کرنے کے بعد مولانا آزاد علامہ اقبال کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: ''علامہ صاحب! کیا یہ ٹھیک ہے؟'' علامہ مرحوم نے زوردار الفاظ میں تائید کرتے ہوئے فرمایا: ''بالکل ٹھیک ہے''۔

معلوم ہوتا ہے یہ ۱۹۲۱ء کے پس وپیش کا واقعہ ہے۔

۱۳) مولانا غلام رسول مہر نے مولانا آزاد اور علامہ اقبال کی ایک ملاقات کا ذکر اپنے

مکتوب گرامی بنام فیض لدھیانوی مورخہ ۲۷ رمئی میں کیا ہے۔ ''اقبال کے ممدوح علماء'' کے حوالے سے الفاظ ملاحظہ فرمائیے:

''ایک ملاقات میرے سامنے نواب ذوالفقار علی خاں مرحوم کی دعوتِ طعام پر ہوئی تھی۔ حضرت علامہ نے بطور خاص فرمایا تھا کہ ہمیں مولانا آزاد کے ساتھ بٹھایا جائے تاکہ ان سے باتیں کرسکیں۔ میں نے اس کا انتظام کیا اور کھانے کے دوران میں دونوں بزرگ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے تک باتیں کرتے رہے۔''

یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ یہ ملاقات کب اور کس سن میں ہوئی۔ ممکن ہے یہ بھی ۱۹۲۱ء کے لگ بھگ کا واقعہ ہو۔

۱۴) بعض اہم مسائل کی گرہ کشائی کے لئے علامہ اقبال خود تو مولانا کے بابِ تحقیق پر دستک دیتے ہی تھے، دیگر تشنگانِ علوم کو بھی ان سے رجوع کرنے کے متعلق فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ (خطوط اقبال: صفحہ ۱۶۳۔۱۶۷، شائع کردہ مکتبہ خیابانِ ادب کے حوالے سے) افضل حق قرشی ''اقبال کے ممدوح علماء'' میں لکھتے ہیں کہ سید محمد سعید الدین جعفری کے نام ایک خط میں علامہ نے ان کو ''اسلام کا مطالعہ: زمانہ حال کی روشنی میں'' کے متعلق لکھا:

''میری رائے میں بحیثیت مجموعی زمانہ حال کے مسلمانوں کو امام ابن تیمیہؒ اور شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ ان کی کتب زیادہ تر عربی میں ہیں مگر شاہ صاحب موصوف کی حجۃ اللہ البالغہ کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ حکماء میں ابن رشد اس قابل ہے کہ اسے دوبارہ دیکھا جائے۔ علیٰ ہذا القیاس غزالی اور رومی علیہم الرحمۃ، مفسرین میں معتزلی نقطہ خیال سے زمخشری، اشعری نقطہ خیال سے رازی اور زبان و محاورے کے اعتبار سے بیضاوی —— میری رائے میں سید سلیمان ندوی اور مولانا ابوالکلام اس بارے میں بہتر مشورہ دے سکیں گے۔''

۱۵) یکم اپریل ۱۹۲۳ء کو مولانا نے کلکتہ سے عبدالرزاق ملیح آبادی کی ادارت میں عربی کا پندرہ روزہ ''الجامعۃ'' جاری کیا تھا۔ اس کا آخری شمارہ مارچ ۱۹۲۴ء میں شائع ہوا۔ یہ اخبار ایک سال جاری رہا اور اس اثناء میں اس کے تیرہ شمارے معرضِ اشاعت میں آئے۔

مجھے یہ تو معلوم تھا کہ مولانا آزاد نے اس نام کا ایک پندرہ روزہ رسالہ جاری فرمایا تھا، لیکن یہ رسالہ کہیں دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ ۱۹۸۵ء کی بات ہے کہ بہت عرصے کے بعد پرانی انارکلی میں ایک پرانے واقف کار حافظ ابوبکر صاحب سے اتفاقاً ملاقات ہوگئی۔ یہ مولانا

عبدالعزیز آفندی کے بیٹے ہیں جو مولانا کے بے حد معتقد تھے اور جنہوں نے لاہور کے محلّہ فاروق گنج میں ''الہلال بک ایجنسی'' کے نام سے ایک اشاعتی ادارہ قائم کیا تھا۔ اس ادارے کی طرف سے مولانا کی کئی کتابیں شائع ہوئی تھیں۔ امام ابن تیمیہ کی چند کتابوں کے اردو ترجمے بھی شائع ہوئے تھے جو مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی سے کرائے گئے تھے۔

مولانا عبدالعزیز آفندی کو میں نے دیکھا ہے' وہ بڑے خوبصورت اور خوش مزاج شخص تھے۔ میں تقسیم ملک کے کچھ مدت بعد مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کے ساتھ ان کے گھر گیا تھا۔ اس وقت وہ فالج کے مرض میں مبتلا تھے' لیکن نہایت خندہ پیشانی سے پیش آئے اور مولانا آزاد سے اپنے دیرینہ تعلقات کے بارے میں چند باتیں بیان کیں۔

میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ حافظ ابوبکر صاحب مجھے ٹولنٹن مارکیٹ میں شمیم بیکرز میں لے گئے۔ وہاں انہوں نے لکڑی کا ایک صندوق رکھا تھا' جس میں ان کے والد کے کچھ کاغذات اور الہلال اور البلاغ کے چند فائل تھے۔ ''الجامعہ'' کا فائل بھی میں نے وہاں دیکھا۔ میرا خیال ہے کہ لاہور میں حافظ ابوبکر کے سوا ''الجامعہ'' کا فائل کسی کے پاس نہیں ہوگا۔

الجامعہ کی ورق گردانی کی تو اس کے ایک شمارے میں علامہ اقبال کے مشہور اور مقبول ''ترانہ ملی'' کا عربی نظم میں ترجمہ کیا گیا تھا——— شروع میں ایک طویل نوٹ تھا جس میں بتایا گیا تھا کہ:

> ''ترانہ ملی کا شمار عمدہ ترین نظموں میں ہوتا ہے اور یہ قارۂ ہند کے ممتاز شاعر اور نامور فلسفی علامہ اقبال کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ اقبال یورپ کی مشہور یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ وسند یافتہ ہیں۔ ہندوستان کی اس بلند پایہ شخصیت کو جدید علوم پر عبور حاصل ہے اور اپنے اقران ومعاصرین میں ان کو نہایت احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ان کی شاعری خدمت اسلام اور احیائے دین کا بہترین ذریعہ ہے۔ باشندگانِ وطن انتہائی شوق سے ان کا کلام پڑھتے اور اس سے بے حد متاثر ہوتے ہیں۔ انگلستان میں ان کے اشعار کا اچھا خاصا حصہ انگریزی میں منتقل ہو چکا ہے' جو وہاں کے اصحابِ علم کے مطالعے میں آ رہا ہے' اور وہ لوگ ان کے افکار کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔''

یہ ۱۹۸۵ء کی بات ہے۔ بیٹھے بیٹھے دو مرتبہ میں نے عربی کا یہ نوٹ پڑھا اور بحمداللہ اس کا ترجمہ ذہن کی گرفت میں آ گیا جو گھر آ کر ایک کاپی میں لکھ لیا۔

اُس وقت ادارہ ثقافت اسلامیہ کے اکیڈمک ڈائریکٹر سراج منیر تھے۔ میں نے ان کو

بتایا تو بڑے خوش ہوئے اور کہا کہ اس پر مضمون لکھئے اور وضاحت کیجئے کہ مولانا آزاد کے دل میں علامہ اقبال کی کیا قدر و منزلت تھی—— لیکن افسوس ہے کہ میں اس وقت مضمون نہ لکھ سکا۔

اس سے چار سال بعد ۱۹۸۹ء میں ہمارے محترم دوست ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری کی کتاب ''مولانا ابوالکلام آزاد کی صحافت'' شائع ہوئی۔ وہ اپنی ہر تصنیف ازراہِ کرم اس فقیر کو ارسال کرتے تھے۔ یہ کتاب بھی ارسال فرمائی۔ اس کے صفحہ ۱۸۳ پر ''الجامعہ'' کا ذکر ہے اور ''ترانہ ملی'' کے عربی ترجمے اور اقبال سے متعلق تعارفی نوٹ کا تذکرہ بھی ہے۔ الفاظ کے کچھ فرق سے بالکل یہی ترجمہ ہے جو گزشتہ سطور میں درج کیا گیا ہے۔ نوٹ پڑھتے وقت میں نے یہ خیال نہیں کیا تھا کہ ترجمہ کس نے کیا ہے۔ اس کا علم ڈاکٹر صاحب موصوف کی کتاب سے ہوا۔ وہ اس کے صفحہ ۱۸۴ پر لکھتے ہیں:

> ''الجامعہ نے آئندہ شماروں میں علامہ مرحوم کے فارسی کلام کی اشاعت کا بھی وعدہ کیا تھا۔ ''ترانہ ملی'' کا منظوم عربی ترجمہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں عربی کے استاد مولانا عبدالحق حقی اعظمی بغدادی نے کیا تھا۔ مولانا عبدالحق عربی کے ادیب اور شاعر تھے۔ ''الجامعہ'' نے ان کی متعدد منظومات شائع کی ہیں۔''

اندازہ کیجئے اقبال کے بارے میں مولانا کے کیا خیالات ہیں اور وہ انہیں کتنا بڑا فلسفی اور شاعر سمجھتے ہیں۔ ان کی کسی نظم کو پہلی مرتبہ مولانا ہی کے اخبار میں عربی میں منتقل کیا گیا۔ یہ بہت بڑا اعزاز ہے جس کا مولانا نے اقبال کو مستحق گردانا۔

۱۶) عربی کا پندرہ روزہ ''الجامعہ'' بند ہوا تو اس سے کچھ عرصہ بعد مولانا نے کلکتہ سے روزنامہ ''پیام'' جاری کیا۔ اس کے ایڈیٹر بھی عبدالرزاق ملیح آبادی تھے۔ صحیح تاریخ کا تعین کرنا تو مشکل ہے، لیکن اندازہ یہ ہے کہ ''پیام'' ۱۹۲۵ء کے پس و پیش جاری کیا گیا تھا۔ عبدالرزاق ملیح آبادی اپنی کتاب ''ذکر آزاد'' کے صفحہ ۳۲۱ پر ایک عنوان قائم کرتے ہیں: ''ڈاکٹر اقبال، ملک الشعراء''۔ اس عنوان کے تحت وہ لکھتے ہیں:

> ''اس زمانے کا ایک واقعہ قابل ذکر ہے۔ مصری شاعر احمد شوقی باشا کو عرب ملکوں نے ''امیر الشعراء'' کا خطاب دیا تھا۔ اس پر مولانا (آزاد) کو خیال ہوا کہ ہندوستان میں ڈاکٹر اقبال کو ''ملک الشعراء'' بنا دیا جائے۔ ایک دن صبح مولانا ہاتھ میں کچھ کاغذ لئے میرے کمرے میں آئے اور اپنا خیال ظاہر کیا۔ میں نے سختی سے مخالفت کی۔ متعجب ہو کر فرمایا:

کیا ڈاکٹر اقبال اس خطاب کے اہل نہیں ہیں؟

عرض کیا: ڈاکٹر صاحب کے شاعرانہ کمالات کے مبصر آپ ہیں۔ مجھے شاعری سے ذوق نہیں، لیکن ڈاکٹر صاحب محض شاعر ہی نہیں ہیں، سیاسی لیڈر بھی ہیں اور ہم ان کی سیاست کے مخالف ہیں۔ ملک الشعراء بن کر وہ سیاسی فائدے بھی اٹھا سکتے ہیں۔

مولانا سوچ میں پڑ گئے اور میں کہتا رہا: اخبار کے مالک آپ ہیں اور جو تجویز چاہیں پیش کر سکتے ہیں، لیکن جب تک ایڈیٹر میں ہوں، اپنے ضمیر کے خلاف کسی تجویز کی حمایت نہیں کر سکتا۔ میرا نام ایڈیٹری سے الگ کر دیا جائے، اس کے بعد بھی اخبار کی خدمت جاری رکھوں گا''۔

وہ آگے لکھتے ہیں:

''مولانا با اصول اخبار نویس تھے اور اپنے اخبار کے ایڈیٹر کی رائے کا احترام کرتے تھے۔''

فرمائیے ملک الشعراء کا خطاب اقبال کو کس نے دینا چاہا: مولانا ابوالکلام آزاد نے یا اقبال کے موجودہ مداحوں میں سے کسی مداح نے؟ اس کے بعد کیا فرماتے ہیں وہ حضرات جن کا ارشاد ہے کہ مولانا آزاد نے کہیں اقبال کا نام نہیں لیا؟ اگر اقبال کے نام کی کوئی دکان سجانا ہے یا ''اقبال کے شاہین'' یا ''اقبال اور عورت'' وغیرہ قسم کی کوئی کتاب تصنیف کرنا یا مضمون لکھنا ہے تو انہوں نے واقعی یہ کام نہیں کیا۔

۱۷) سید سلیمان ندوی کے نام اقبال کے بہت سے خطوط دستیاب بھی ہو گئے ہیں اور چھپ بھی گئے ہیں، مگر جو خطوط انہوں نے مولانا کو لکھے، افسوس ہے وہ شائع نہیں ہوئے اور شاید دستیاب بھی نہ ہوئے ہوں، تاہم سید صاحب اور بعض دیگر حضرات کے نام مرسلہ خطوط سے واضح ہوتا ہے کہ انہوں نے بہت سے علمی معاملات میں مولانا کی خدمت میں خطوط ارسال کئے تھے، یقیناً مولانا نے بھی جواب میں خط لکھے ہوں گے، مگر وہ ابھی تک منصۂ شہود پر نہیں آئے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ان میں سے کچھ خطوط دستیاب تو کہیں سے ہو گئے ہوں، مگر کچھ حضرات ان کو شائع کرنا مناسب نہ سمجھتے ہوں؟ اقبال کے بارے میں جس قسم کے افکار یہ مولانا کی طرف منسوب کرتے ہیں، ان کے پیش نظر کسی کے دل میں اس شبہ کا کروٹ لینا بعید از قیاس نہیں ہے۔

شیخ عطاء اللہ کے مرتبہ اقبال نامہ کے حصہ اوّل میں ایک خط شائع ہوا ہے، جو علامہ نے

سید سلیمان ندوی کی خدمت میں ۱۸/اگست ۱۹۲۴ء کو لکھا۔ تحریر فرماتے ہیں:

''امریکہ کی مشہور یونیورسٹی (کولمبیا) نے ایک کتاب شائع کی ہے' جس کا نام ''مسلمانوں کے نظریات متعلقہ مالیات'' ہے۔ اس کتاب میں لکھا ہے کہ اجماع امت نص قرآنی کو منسوخ کرسکتا ہے' یعنی یہ کہ مثلاً مدتِ شیر خوارگی جو نص کی رو سے دو سال ہے' کم یا زیادہ ہوسکتی ہے' یا حصص شرعی میراث میں کمی بیشی کرسکتا ہے۔ مصنف نے لکھا ہے کہ بعض حنفاء اور معتزلہ کے نزدیک اجماع یہ اختیار رکھتا ہے' مگر اس نے کوئی حوالہ نہیں دیا۔ آپ سے یہ امر دریافت طلب ہے کہ آیا مسلمانوں کے فقہی لٹریچر میں کوئی ایسا حوالہ موجود ہے؟ امر دیگر یہ ہے کہ آپ کی ذاتی رائے اس بارے میں کیا ہے؟ میں نے مولوی ابوالکلام صاحب کی خدمت میں بھی عریضہ لکھا ہے۔''

علامہ کے اس سوال اور مولانا کے جواب کو علمی اعتبار سے بڑی اہمیت حاصل ہے' مگر افسوس ہے دونوں حضرات کے مکتوبات دستیاب نہیں ہیں۔

۱۸) مولانا آزاد اور علامہ اقبال کے ملاپ اور دونوں کے ایک ہی مقام پر تشریف فرما ہونے کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو جو مالک رام کی کتاب ''کچھ ابوالکلام آزاد کے بارے میں'' کے صفحہ ۹ سے یہاں درج کی جاتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''غالباً ۱۹۲۷ء کے اواخر کی بات ہے' سائمن کمیشن کی تشکیل اور اس کی ہندوستان میں آمد کی تاریخ کا اعلان ہو چکا تھا۔ بیشتر سیاسی حلقے اس پر سخت ناراض بلکہ برافروختہ تھے کہ کمیشن میں کوئی ہندوستانی نہیں لیا گیا تھا۔ اس لئے اکثر جماعتوں نے کمیشن کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا۔ لاہور کے سر محمد شفیع اور ان کے ہم نوا بائیکاٹ کے حق میں نہیں تھے۔ لاہور میں جلسہ ہوا' جس کا مقصد حکومت کی پالیسی کے خلاف احتجاج اور لوگوں کو کمیشن کے بائیکاٹ کی ترغیب دلانا تھا۔ جلسہ غالباً موچی دروازے (یا شاید بھاٹی دروازے) کے باہر کمیٹی باغ میں ہوا تھا۔ اسٹیج پر من جملہ اور اصحاب کے مولانا آزاد اور علامہ اقبال اور مولانا محمد علی تشریف فرما تھے۔ مجھے آج تک یاد ہے کہ مولانا محمد علی نے اپنی تقریر میں فرمایا تھا کہ ہم نے اسلام کی تعلیم ان دونوں بزرگوں ـــــ اقبال اور آزاد ـــــ سے پائی۔ آج ایک ہمیں کمیشن سے تعاون کی تلقین کر رہے ہیں۔ دوسرے اس کے بائیکاٹ کی۔ ہم عجب گومگو میں ہیں کہ کس کا تتبع کریں۔'' [اس میں اشارہ اقبال کی فارسی مثنویات (اسرار و رموز) اور مولانا آزاد کے ہفت روزہ

الہلال کی طرف تھا]

یہاں یہ یاد رہے کہ اقبال کا تعلق میاں سر محمد شفیع سے تھا اور ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ سائمن کمیشن کا بائیکاٹ نہ کیا جائے' جب کہ مولانا آزاد اور مولانا محمد علی وغیرہ بائیکاٹ کی مہم چلا رہے تھے۔

۱۹) مولانا محمد حنیف ندوی نے ایک سے زائد مرتبہ بتایا کہ مولانا لاہور تشریف لاتے تو زیادہ تر میاں عبدالعزیز بار ایٹ لاء کی کوٹھی (بیرون یکی دروازہ) میں قیام فرماتے تھے۔ بے شمار لوگ ان سے ملاقات کے لئے وہاں آتے تھے۔ علامہ اقبال خاص طور سے آتے اور مختلف مسائل پر مولانا سے گفتگو فرماتے۔ ایک مرتبہ وہ اپنے چند دوستوں کے ساتھ آئے' جن میں ان کے بے تکلف دوست چوہدری شہاب الدین بھی تھے۔ علامہ نے مولانا سے کوئی بات پوچھی' مولانا نے تفصیل سے جواب دیا۔ اب علامہ مطمئن ہو گئے تھے۔ مزید سوال کی یا بحث کرنے کی ضرورت نہ تھی' لیکن چوہدری شہاب الدین چونکہ علامہ سے نہایت بے تکلفانہ مراسم رکھتے تھے اور بالعموم ان سے پنجابی میں بات کیا کرتے تھے' اس لئے انہوں نے علامہ اقبال سے پنجابی میں کہا:

اوئے ساڈے نال اوکھا ہوندا سیں' ہن کر گل!

مولانا آزاد تو ان کی بات سمجھ نہیں پائے' لہٰذا خاموش رہے' لیکن دوسرے حاضرین مجلس چوہدری صاحب کے اندازِ کلام سے بہت محظوظ ہوئے۔ یہ ۱۹۳۱ء کے لگ بھگ کی بات ہے۔

۲۰) اقبال نامہ کے حصہ اوّل میں سید صاحب کے نام علامہ کے ایک خط مرقومہ ۷/اگست ۱۹۳۶ء کے چند الفاظ یہ ہیں:

''الحمدللہ کہ اب قادیانی فتنہ پنجاب میں رفتہ رفتہ کم ہو رہا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی دو تین بیان چھپوائے ہیں' مگر حال کے روشن خیال علماء کو ابھی بہت کچھ لکھنا باقی ہے۔''

۲۱) علامہ اقبال کی وفات کا حادثہ ۲۱/اپریل ۱۹۳۸ء کو پیش آیا تھا۔ اس سے چار دن بعد ۲۵/اپریل ۱۹۳۸ء کو مولانا آزاد نے مولانا محی الدین احمد قصوری کے نام کلکتہ سے خط لکھا جو ''تبرکاتِ آزاد'' کے صفحہ ۴۷ پر درج ہے۔ خط کا نمبر ۱۶ ہے۔ مولانا تحریر فرماتے ہیں:

''اقبال کی موت سے نہایت قلق ہوا۔

بہت آگے گئے' باقی جو ہیں طیار بیٹھے ہیں''۔

ان الفاظ کے حاشیئے میں مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں:

''مولانا نے اس قلق انگیز واقعے پر ایک بیان بھی دیا تھا۔ یہ چند الفاظ ہیں' لیکن دیکھئے ان میں دردِ دل کس طرح کھنچ آیا ہے۔''

مولانا تیار کو ''طیار'' لکھا کرتے تھے' ہم نے یہاں وہی لفظ رہنے دیا ہے جو انہوں نے استعمال فرمایا تھا۔

۲۲) اقبال کی وفات پر مولانا کا ایک تعزیتی بیان افضل حق قرشی نے عبداللہ انور بیگ کی کتاب دی پوئٹ آف دی ایسٹ (انگریزی) کے صفحہ ۵۶ سے ''اقبال کے ممدوح علماء'' میں نقل کیا ہے:

''یہ تصور کس قدر الم ناک ہے کہ اقبال ہم میں نہیں۔ جدید ہندوستان اردو کا اس سے بڑا شاعر پیدا نہیں کر سکتا۔ اس کی فارسی شاعری کا بھی جدید فارسی ادب میں اپنا ایک مقام ہے۔ یہ تنہا ہندوستان کا ہی نہیں بلکہ پورے مشرق کا نقصان ہے۔ ذاتی طور پر میں ایک پرانے دوست سے محروم ہو گیا ہوں۔''

۲۳) ''غبارِ خاطر'' کے مکتوب نمبر ۲۰ میں جو ۱۸ مارچ ۱۹۴۳ء کا تحریر فرمودہ ہے' مولانا نے اقبال کا یہ شعر درج کیا ہے:

تا تو بیدار شوی ' نالہ کشیدم' ورنہ
عشق کاریست کہ بے آہ و فغاں نیز کنند

یہ شعر زبورِ عجم (طبع دوم' اپریل ۱۹۴۴ء) کے صفحہ ۱۰۱ پر مرقوم ہے۔

مالک رام نے اپنی مرتبہ ''غبارِ خاطر'' میں لکھا ہے کہ سید مقبول حسین وصل گرامی نے ماہانہ رسالہ ''مرقع'' جاری کرنے کا فیصلہ کیا تو انہوں نے اقبال سے درخواست کی کہ ''مرقع'' کے سرورق پر چھاپنے کے لئے کوئی شعر عنایت فرمایئے۔ اس پر اقبال نے یہ شعر لکھ بھیجا۔ تین برس تک یہ ''مرقع'' کے سرلوح پر چھپتا رہا۔

''غبارِ خاطر'' مولانا کی نہایت مقبول و مشہور کتاب ہے۔ مالک رام صاحب نے بڑی محنت سے اس کے عربی' فارسی اور اردو اشعار کی تخریج کی ہے اور حل طلب مقامات پر حواشی لکھے ہیں۔ یہ کتاب مختلف اوقات میں بہت سے ناشروں نے شائع کی' مگر مکتبہ رشید یہ لاہور کا ایڈیشن کاغذ' کتابت' جلد وغیرہ میں سب سے بازی لے گیا ہے۔ اس میں ایک قابل تحسین

کام یہ کیا گیا کہ فارسی اور عربی کے اشعار کا اردو ترجمہ کر دیا گیا ہے۔ اب فارسی اور عربی سے ناواقف حضرات بھی اس سے پورا استفادہ کر سکتے ہیں۔

کتاب میں کم وبیش سات سو شعر ہیں جن کی تخریج کی گئی ہے' دو سو اردو کے اور پانچ سو عربی و فارسی کے۔ یہ نہایت اہم کام مالک رام نے کیا جبکہ ان کا ترجمہ مکتبہ رشیدیہ کے مالک و مدیر حافظ عبدالرشید ارشد کی محنت و کوشش سے ہوا۔

یہ ہے مولانا ابوالکلام آزاد اور علامہ اقبال کے باہمی مراسم و علائق کی ایک جھلک..... کوئی اہم مسئلہ درپیش ہو تو علامہ خود بھی مولانا سے دریافت کرتے ہیں اور لوگوں کو بھی ان کے علم و فضل سے مستفید ہونے کا مشورہ دیتے ہیں' ان کی تصانیف کا مطالعہ کرتے ہیں اور اپنی تصانیف ان کو بھجواتے ہیں' ان کے اخبار (الہلال) کے لئے خریدار مہیا کرتے ہیں۔ مولانا بھی ان کے فکر و فن' شاعرانہ کمالات اور فلسفہ و حکمت کے قدردان ہیں اور برملا اس کا اظہار فرماتے ہیں' بلکہ انہیں ملک الشعراء کا خطاب دینے کی تجویز پیش کرتے ہیں۔ ان کے اردو کلام کو عربی کا جامہ پہناتے ہیں۔ اپنے اخبار (البلاغ) کے صفحہ اول پر ان کا کلام شائع کرتے ہیں' جبکہ ان کے علاوہ اس سے قبل یا بعد کسی بڑے سے بڑے شاعر کے کلام کو الہلال یا البلاغ کے پہلے صفحے پر چھپنے کا اعزاز حاصل نہیں ہوا۔ اپنی معروف کتاب ''غبارِ خاطر'' میں ان کا شعر درج کرتے ہیں' حالانکہ اس کتاب میں ان کے کسی معاصر شاعر کا کوئی شعر درج نہیں ہوا۔ ان کی وفات پر بیان دیتے ہیں' جس میں گہرے حزن و ملال کا اظہار کیا جاتا ہے۔ معلوم نہیں بعض لوگ کیوں ان کو باہم لڑانے اور ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہنے پر زور دیتے ہیں' جبکہ یہ دونوں دوست ہیں اور ایک دوسرے سے محبت کا برتاؤ کرتے ہیں۔

گزشتہ سطور میں مولانا سے متعلق نہایت اختصار کے ساتھ چند واقعات درج کئے گئے ہیں۔ اب چند الفاظ ان کے سفر آخرت کے بارے میں پڑھئے۔

۱۵ر فروری ۱۹۵۸ء کو پریڈ گراؤنڈ دہلی میں کُل ہند اردو کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا' جس کا افتتاح وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے کیا۔ اس اجلاس میں مولانا آزاد بھی شریک تھے اور انہوں نے تقریر بھی کی تھی۔ ان کی زندگی کی یہ آخری تقریب تھی' جس میں وہ شریک ہوئے اور آخری تقریر تھی جو انہوں نے فرمائی۔

۱۹ر فروری کو وہ معمول کے مطابق علی الصباح اٹھے اور غسل خانے میں گئے۔ غسل خانے ہی میں اچانک فالج کا حملہ ہوا اور وہ گر پڑے۔ گرتے ہی بے ہوش ہو گئے۔ مسلسل تین

دن یہی حالت رہی۔ درمیان میں ایک یا دو مرتبہ ہوش کی کچھ لہر سی آئی تو قریب بیٹھے ہوئے کسی شخص کو پہچانا۔ اسی اثنا میں پنڈت جواہر لال نہرو قریب آئے تو انہیں ''خدا حافظ'' کہا۔ ایک موقع پر ڈاکٹروں سے آکسیجن گیس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

''مجھے پنجرے میں کیوں قید کر رکھا ہے۔ بس اللہ پر چھوڑ دو۔''

علاج معالجے کی تمام انسانی کوششیں کی گئیں اور ہر قسم کی تدبیریں آزمائی گئیں، مگر وہی ہوا جو اللہ کو منظور تھا۔ حالت انتہائی خطرناک تھی اور تمام دنیا میں منٹ منٹ کی خبریں پہنچ رہی تھیں۔ پاکستان کے اخبار تین دن کافی تاخیر سے چھپتے رہے کہ معلوم نہیں کس وقت کسی المیے کی خبر آ جائے۔ آخر ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء (۲ر شعبان ۱۳۷۷ھ) کو جمعہ اور ہفتہ کی درمیانی رات ہندوستانی وقت کے مطابق دو بج کر دس منٹ پر اپنی سرکاری قیام گاہ (واقع کنگ ایڈورڈ روڈ نئی دہلی) میں تقریباً ستر سال کی عمر میں اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

وحدت امت

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کی تالیف:
''شیعہ سنی مفاہمت کی اہمیت اور ضرورت''

پر ایک شیعہ دانشور محترمہ بلقیس سبزواری کا غیر جانبدارانہ تبصرہ

محترمہ بلقیس سبزواری ایک نہایت مشّاق اور پُر گو شاعرہ ہیں۔ اس سے قبل ان کے دو شعری مجموعے ہمارے پاس آ چکے ہیں : ایک ''زرد موسم'' اور دوسرا ''نقشِ انسان'' ـــــ جن سے ان کی انفرادیت کا بھرپور اظہار ہوتا ہے۔ ان کتابوں پر تو تبصرہ بعد میں شائع کیا جائے گا' فی الحال ان کی ایک مختصر تحریر مندرجہ بالا موضوع پر پیش خدمت ہے۔ محترمہ خود شیعہ اثنا عشری مکتبہ فکر سے تعلق رکھتی ہیں اور یہ تعلق اپنی جگہ بہت پختہ اور گہرا ہے' لیکن اس سے ان میں تعصب کی تنگ نظری نہیں آئی۔ ان کے والد بزرگوار شیعہ حلقے کے بہت مشہور اور نامور عالم تھے' جن کا اسم گرامی علامہ قمر الزمان سبزواری تھا اور وہ دیال سنگھ کالج میں استاذ تھے' جن کا انتقال ۱۹۶۰ء میں ہو گیا تھا! محترمہ بلقیس سبزواری نے ایک شعر تو ڈاکٹر اسرار احمد کی شان میں لکھا ہے یعنی: ؎

ان کی بلندیوں کو کہاں پائے آفتاب
وہ تو غریب خود بھی مسافر ہے رات کا!

اور ساتھ ہی ڈاکٹر صاحب کے ناقدین کے ضمن میں فرمایا ہے: ؎

ان کی رقابتوں کی منازل کو کیا کہیں
جو آسماں کو زیر زمیں دیکھتے رہے!

احکامِ شریعت کو سمجھنے کے لئے رجحان اور احساس اپنی جگہ لیکن نئے دور کے کچھ اپنے تقاضے ہیں جو مسائل کو سامنے رکھ کر اس کا حل چاہتے ہیں۔ بعض افکار کی قرآن وسنت سے وضاحت ہو جاتی ہے لیکن کچھ احکامات ایسے ہیں کہ فقہ کی روشنی میں ان کے مآخذ تلاش کئے جاتے ہیں' اور وہ مشکلات جو مقصد کی راہ میں حائل ہوتی ہیں ان کو دور کرنے کے لئے عقل واحد راستہ ہے جو موزونیت اور حقیقت کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

محترم بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کی کتاب ''شیعہ سنی مفاہمت کی اہمیت اور ضرورت'' زیرِ نظر ہے۔ اس کتاب میں ڈاکٹر صاحب نے بالیدگی نظر اور حقیقت پسندی کے ساتھ عالمانہ اور عارفانہ بحث کی ہے۔ اس میں آپ کی فکری کوشش کے علاوہ اسلامی جذبہ بھی شامل ہے۔ یہ کتاب ہر مسلمان کو غور و فکر کی دعوت دیتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی دورِ ماضی اور عہد حاضر دونوں پر گہری نظر رہی ہے۔ کسی خاص عقیدے پر تبصرہ یا تنقید کرنا آپ کا مقصد نہیں رہا ہے۔ یہ آپ کی ایمان اور اسلام سے وابستگی کی علامت ہے کہ آپ نے اپنی تحریر میں فرض کی ادائیگی' وسعت نظری' فکری گہرائی' معاملہ فہمی' اسلام شناسی' سچائی اور دیانت داری کا خاص خیال رکھا ہے۔ مجھے آپ سے تبادلہ خیال کر کے ایک فکری روشنی کا احساس ہوا۔ آپ نے بے پناہ قوتِ ارادی کا مظاہرہ کیا ہے اور وہ کمزور عقائد کے انسان نہیں ہیں۔ مسلمانوں کے باہمی انتشار کے خاتمہ اور اسلام کو عام کرنے کے لئے ان کی خدمات قابل ستائش ہیں۔ وہ ایک قلب مطمئن اور آسودہ مسکراہٹ کے ساتھ آنے والوں کا استقبال کرتے ہیں۔ تحریر اور تقریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ علم و کمال ان کا ادبی ورثہ ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا مقصد علمی بنیاد پر اسلام کا علمی' اخلاقی' نظریاتی اور روحانی تعارف کرانا ہے' تاکہ اسلامی اصولوں سے شناسائی اور دین میں بنیادی استحکام ہو' تاکہ اسے مؤثر طور پر نفاذ کے ذریعہ عمل میں لایا جا سکے۔ دراصل عبادت کی رسمی ادائیگی اور چیز ہے لیکن مکمل بصیرت و آگاہی' آفاقیت' حقانیت' استقامت اور معرفت سے اسلام کو سمجھنا اور بات ہے۔ کچھ عقائد اور مسائل ایسے ہوتے ہیں جن کو عام کرنے سے صرف ذہنی توانائی صرف ہوتی ہے لیکن انتشار اور تنازعہ کے سوا کچھ نہیں ملتا' جس کا نقصان نہ صرف اسلام بلکہ پوری انسانیت کو پہنچتا ہے۔ بعض عقائد مثلاً اوقاتِ نماز میں فرق' مسئلہ خلافت' مسئلہ غیبت امام مہدی' احادیث اور زکوٰۃ کے مسائل وغیرہ کے ضمن میں اگر صرفِ نظر سے کام لیتے ہوئے مصالحت کا رویہ اختیار کیا جائے تو فرقہ واریت کی آگ پر قابو پایا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی یہ کتاب گہری فکری نظر اور کاوش کا نتیجہ ہے۔ یہ کتاب اتحاد بین المسلمین کی طرف ایک اہم قدم ہے' مگر اس سے استفادے کے لئے لازم ہے کہ ایک شخص خود ہم آہنگی کے جذبات کے ساتھ بالغ نظر اور متوازن شخصیت کا حامل ہو۔ جب تک کوئی انسان ذہنی طور پر صحیح بات کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا وہ صحیح مذہبی اقدار سے خائف یا انہیں سمجھنے میں دشواری محسوس کرتا ہے' کیونکہ اکثر ماضی کے واقعات کو ذہن قبول نہیں کرتا' اور

اگر کرتا بھی ہے تو ان کے لئے دلائل تلاش کرتا رہتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنی کتاب میں سب سے پہلے اسلام کے مختلف فقہی مسالک' ان کی اہمیت اور حیثیت کا ذکر کیا ہے کہ ان کے لئے ہماری طرزِ فکر کیا ہونی چاہئے۔ اس کے علاوہ شیعہ سنی فقہی مسائل' شیعہ سنی تفرقہ بازی کا اصلی سبب اور اس کے نتائج پر روشنی ڈالی ہے۔ آپ نے امام مہدی کی شخصیت پر بھی بات کی ہے' علماء کا اختلاف اور نئی نسل کی بے راہ روی کا تذکرہ کیا ہے' دین اور شریعت کا فرق اور تکمیل رسالت پر زور دیا ہے۔ آپ کے نزدیک پیغمبر اسلامؐ پر نبوت کا ختم ہونا اہم بات نہیں ہے' آپ کی فضیلت کی بنیاد تکمیلِ نبوت و رسالت ہے۔ آپ نے تکفیر کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ چودہ سو سال میں اُمت میں بڑے بڑے اختلاف ہوتے رہے لیکن تکفیر کا مسئلہ پھر بھی نہیں آیا' کیونکہ تکفیر کا مسئلہ اُس کے لئے آتا ہے جو ختم نبوت کا منکر ہو۔ تفرقہ سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ ''دین کو قائم رکھو' اس میں تفرقہ مت ڈالو''۔ ڈاکٹر صاحب نے شیعہ سنی اختلاف کی ایک اور وجہ بھی بتائی ہے' وہ ہے احادیث کے الگ الگ ذرائع۔ جو احادیث اہل سنت کے نزدیک معتبر ہیں وہ اہل تشیع کے نزدیک درست نہیں ہیں اور جو احادیث شیعہ پیش کریں گے وہ اہل سنت کے نزدیک درست اور معتبر نہیں ہیں۔ لیکن اس کے باوجود تفرقہ ختم کیا جا سکتا ہے' کیونکہ اللہ کی حاکمیت' پیغمبر اسلام کی اطاعت اور قرآن حکیم پر عمل دونوں میں مشترک ہے' اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ مسلمانوں میں اس اختلاف کی وجہ سے افراتفری' بدامنی اور عدم استحکام نے جنم لیا ہے جس کی وجہ سے نفاذِ اسلام کی راہ میں رکاوٹ پیدا ہو رہی ہے۔ آپ نے کہا ہے کہ شیعہ سنی اختلاف بہت بڑا اختلاف ہے۔ اگر اس میں مفاہمت کی راہ تلاش کی جا سکے تو ملک سے دہشت گردی اور تخریب کاری کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ پاکستان مسلمانوں کا اہم ترین ملک ہے اور یہاں یہ مسئلہ سب سے زیادہ گھمبیر ہے۔ تمام اسلامی ممالک میں سے آپ نے ایران کی تعریف کی ہے کہ اس نے اپنے مذہبی عقائد اور فقہ کے مطابق اسلام قائم کیا ہے۔ آپ نے کہا کہ پاکستان' ایران' افغانستان اور ترکستان کا ایک بہت بڑا اسلامی بلاک بن سکتا ہے بشرطیکہ اتحاد کی کوئی بنیاد ہو اور اسلام سے زیادہ کوئی قدر مشترک نہیں ہے۔

اس مسئلے کا حل محترم ڈاکٹر صاحب نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

> ''میرے نزدیک اس کا حل وہی ہے جو ایران نے پیش کیا ہے اور اس میں وہ ہمیں روشنی فراہم کر چکا ہے۔ کاش کہ پاکستان میں اہل تشیع اس حل کو قبول کر لیں! وہ حل یہ

E:\Ms-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq march05\msl1-02.inp 8/22/2014 4:06 PM PAGE 2 (1,1)

ہے کہ جہاں تک عقائد‘ عبادات‘ مساجد‘ فیملی لاز اور وراثت کے قوانین وغیرہ کا تعلق ہے تو ان میں ہر ایک کو مکمل آزادی ہو کہ وہ اپنی فقہ کے مطابق عمل کرے۔ لیکن ملکی قوانین (Law of the Land) کے معاملے میں صرف اس فقہ کو نافذ کرنے کا اعلان کیا جائے جس کے ماننے والے اکثریت میں ہیں۔ عبادات میں مَیں زکوٰۃ کو بھی شامل کر رہا ہوں۔ زکوٰۃ (معاذ اللہ) صرف کوئی ٹیکس نہیں ہے بلکہ عبادت ہے...... عبادات کا معاملہ ہر ایک پر چھوڑ دیجیے کہ وہ جس طرح چاہے کرے‘ یہ ایک طرح کا انفرادی معاملہ ہے‘ لیکن جہاں تک ملکی قانون (Law of the Land) کا معاملہ ہے تو ظاہر ہے کہ وہ ایک ملک میں دو نہیں ہو سکتے‘ حدود و تعزیرات سب کے لئے الگ الگ نہیں ہو سکتیں۔ اس کے لئے ہمیں ایران سے راہنمائی حاصل کرنی چاہئے۔ وہاں یہ کیا گیا ہے کہ ایران کے دستور میں طے کر دیا گیا کہ ان معاملات میں اکثریت کی فقہ یعنی فقہ جعفری کے مطابق معاملہ ہوگا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کے سوا کوئی حل ہے بھی نہیں۔ یا تو یہ کہہ دیجیے کہ ہمیں اسلام کی طرف جانا ہی نہیں‘ دین کو اٹھا کر ایک طرف پھینک دو‘ ہمیں تو اپنی فقہ زیادہ پسند ہے...... لیکن اگر دین کو اوّلیت حاصل ہے اور آپ ”لَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ“ کے قرآنی حکم پر عمل پیرا ہونا چاہتے ہیں کہ دین ایک ہو تو پھر اپنی فقہوں اور اپنے مذاہب و مسالک کو ثانوی درجہ دیجیے۔ یہی کچھ انہوں نے کیا اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کا یہی حل ہے۔ چنانچہ پاکستان کے دستور میں یا تو یہ طے ہو جائے کہ یہاں فقہ حنفی کو ملکی قانون کی حیثیت حاصل ہوگی‘ کیونکہ یہاں غالب اکثریت اَحناف کی ہے‘ تاہم اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ جو فقہ حنفی آج سے کئی سو سال پہلے مرتب کی گئی تھی وہ جوں کی توں نافذ کر دی جائے گی‘ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اب جو اجتہاد ہوگا اور جو قانون سازی ہوگی وہ فقہ حنفی کے اصولِ فقہ کے مطابق ہوگی۔ یعنی استنباط اور استدلال کے اصول وہی ہوں گے جو فقہ حنفی کے ہیں‘‘۔

ڈاکٹر صاحب نے اس بات پر بار بار زور دیا ہے کہ شیعہ سنی اختلاف کوئی بڑا اختلاف نہیں ہے‘ کیونکہ دونوں اللہ کی حاکمیت‘ رسول ﷺ کی اطاعت اور کتاب اللہ پر مکمل ایمان رکھتے ہیں۔ امام مہدیؒ کے بارے میں یہ بات بھی مشترک ہے کہ امام مہدی حضرت فاطمہؓ کی اولاد اور امام حسنؓ کی نسل سے ہوں گے اور ان کا ظہور مکہ میں ہوگا۔ جہاں تک قرآن حکیم کی محفوظیت کا تعلق ہے اس پر شیعہ علماء جو ایران میں برسرِ اقتدار ہیں‘ کسی شک و شبہ کا اظہار نہیں کرتے۔ شیعہ سنی حضرات میں اصل تنازعہ صحابہ کرام یعنی خلفاء ثلاثہ ؓ کا ہے‘ ان کی حیثیت

کے بارے میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔ شیعہ حضرات کے نزدیک حضرت علیؓ پہلے خلیفہ اور امام ہیں' خلافت ان کا حق تھی اور ان کی نظر میں خلفائے ثلاثہ ؓ غاصب تھے' حضرت علیؓ نے خلفائے ثلاثہ کی خلافت کو کبھی تسلیم نہیں کیا۔ شیعہ حضرات اپنے اس موقف پر قائم ہیں اور فریقین میں شدید تنازعہ پایا جاتا ہے۔ کسی میں بھی حالات کو سمجھنے کے لئے نہ مناسب طرزِ فکر ہے' نہ ادراک اور نہ برداشت۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اختلاف بنیادی باتوں یا عقائد میں نہیں ہے' البتہ کلامی بحثوں میں اختلافات ضرور موجود ہیں' مثلاً امامتِ معصومہ کا تصور سنی عقیدے میں نہیں ہے' ان کے نزدیک معصومیت صرف خاصہ نبوّت ہے' چونکہ نبوت کا دروازہ بند ہو چکا ہے اس لئے امامت معصومہ کا مسئلہ بھی نہیں رہا۔

جہاں تک امام مہدی کے ظہور کا تعلق ہے تو اس پر دونوں کا اتفاق ہے کہ قیامت سے پہلے ایک بڑی شخصیت ظاہر ہوگی۔ فرق یہ ہے کہ اہل تشیع امام غائب کا تصور رکھتے ہیں کہ وہ زندہ ہیں اور غائب ہیں' لیکن اہل سنت کا عقیدہ ہے کہ وہ پیدا ہوں گے اور امام حسنؓ کی اولاد سے ہوں گے۔ ڈاکٹر صاحب خود بھی امام معصوم کے بارے میں شیعوں سے متفق نہیں ہیں' وہ معصومیت کو نبوت تک محدود سمجھتے ہیں اور غیبتِ کبریٰ پر بھی یقین نہیں رکھتے۔ وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ دونوں کے درمیان مفاہمت ہو' تاکہ ملک میں اسلامی نظام کے قیام کی راہ ہموار ہو۔

ڈاکٹر صاحب نے جس انداز میں شیعہ سنی اختلافات اور اس کے نتائج کی بات کی ہے وہ غور طلب ہے۔ اور یہ بھی درست ہے کہ اگر علماء اور دینی رہنماؤں کے درمیان تضاد رہا تو نئی نسل کتاب اللہ کے بارے میں شک و شبہ میں مبتلا ہو جائے گی اور مذہب کی حیثیت ختم ہو جائے گی۔

اسلام کے متفقہ امور اور عملی تجاویز پر ڈاکٹر صاحب کی کاوشوں کو سراہنا چاہئے۔ قیاس آرائیوں اور بدگمانیوں سے فضا کو مکدر نہیں کرنا چاہئے۔ اگر ہمارے درمیان اختلافات ختم نہیں ہوں گے تو نتیجہ کربلا کی صورت میں آتا رہے گا۔ یہ اختلافی مسائل انتہائی ذہانت' دیانت داری' معاملہ فہمی اور غیر جانبدارانہ رویہ کے ساتھ طے ہونے چاہئیں۔ آخر میں مجھ ناچیز کی ذاتی تجویز یہ ہے کہ اعلیٰ سطح پر علمی مراکز قائم ہونے چاہئیں جہاں تحقیق و تربیت کا کام ہو' تاکہ ایسے علماء اور اساتذہ پیدا ہوں جو اسلام کے صحیح فہم کے ساتھ جدید دور کی ضروریات اور نظریات سے واقف ہوں۔

اسلامی قانون کا یہ مقصد ہونا چاہئے کہ اسلام کا بین الاقوامی تعارف کرایا جائے۔ صحافت کے میدان میں بھی اسلامی تحقیق کا کام آگے بڑھنا چاہئے۔اور جو بھی شخص صلاحیت اور ذوق کے مطابق آگے بڑھنے کا ارادہ رکھتا ہو اس کی حوصلہ افزائی ہو تا کہ معاشرے میں پایا جانے والا جمود ختم ہو اور اعتماد بحال ہو جائے۔شکریہ!

بلقیس قمر سبزواری

لاہور

دسمبر ۲۰۰۴ء

قسط وار سلسلہ (17)

بنگلہ دیش (2)

تحقیق وتحریر: سید قاسم محمود

بنگالی مسلمانوں کی سیاسی تاریخ

زمانۂ قدیم میں ہندوستان کے شمال مشرقی حصے کو جہاں بنگالی زبان بولی جاتی ہے بنگ یا بنگالہ کہا جاتا تھا۔ اس میں وہ حصہ بھی شامل تھا جو اب بنگلہ دیش ہے اور وہ حصہ بھی جو ہندوستان کی ریاست بنگال کہلاتا ہے۔ مسلمانوں کی آمد تک (جس کا ذکر گزشتہ قسط میں ہو چکا ہے) یہاں کے باشندے ہندومت اور بدھ مت کے پیروکار تھے۔ عام طور پر یہاں آزاد اور خودمختار حکومتیں قائم رہیں، لیکن جب کبھی شمالی ہند میں کوئی مضبوط مرکزی حکومت قائم ہو جاتی تھی تو بنگال پر بھی اس کی بالادستی قائم ہو جاتی تھی۔

بنگال کا پہلا مسلمان بادشاہ

مسلمانوں کی آمد کے وقت یہاں سینا خاندان کی حکومت تھی جو ہندومت کا پیرو تھا۔ سلطان شہاب الدین غوری کے آخری زمانے میں سلطان دہلی قطب الدین ایبک کے ایک ترک سپہ سالار محمد بختیار خلجی نے جنوبی بہار میں مسلم سلطنت کی توسیع کرنے کے بعد بنگالہ کی طرف کوچ کیا اور اپنی فوج کو پیچھے چھوڑ کر صرف اٹھارہ سواروں کے ساتھ 1201ء میں سین راجا کے دارالحکومت ندیا میں داخل ہوا۔ لکشمی سین کو خبر ملی تو وہ کھانا چھوڑ کر محل کے پچھلے دروازے سے بھاگ نکلا اور ندیا پر جنگ وجدل کے بغیر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ کچھ عرصے کے بعد محمد بختیار خلجی دس ہزار فوج لے کر تبت پر حملہ کرنے کے لئے روانہ ہوا، لیکن پہاڑی راستوں کی دشواری اور نیم وحشی قبائل کی لڑائیوں نے فوج کو بددل کر دیا اور وہ مراجعت پر مجبور ہو گیا۔ جب وہ اپنی حدود میں پہنچا تو تین چوتھائی فوج ضائع ہو چکی تھی اور وہ خود ایسا علیل تھا کہ راستے ہی میں دیوکوٹ کے مقام پر فوت ہو گیا (1205ء)۔ ایک سردار علی بن

مردان خلجی پر شبہ کیا گیا کہ اس نے بیماری میں محمد بختیار خلجی کو ہلاک کر دیا ہے۔ چنانچہ اسے گرفتار کر کے عز الدین محمد شیران کو لکھنوتی کا حاکم بنایا گیا' جو شاہی لقب اختیار کئے بغیر خود مختارانہ حکومت کرنے لگا۔ علی بن مردان کچھ ہی دنوں بعد فرار ہو کر دہلی پہنچا اور اپنی صفائی پیش کر کے قطب الدین ایبک سے ولایتِ بنگال کی سند لے کر لکھنوتی آیا جو اس وقت خود مختار اسلامی سلطنت کا دارالحکومت تھا۔ شیران شکست کھا کر بھاگ گیا اور ایبک کے گورنر کی حیثیت سے علی بن مردان حکومت کرنے لگا۔ بنگال کا پہلا مسلمان بادشاہ یہی تھا۔

آزاد مسلمان بادشاہتیں

قطب الدین ایبک کی وفات (نومبر 1210ء) کے بعد علی بن مردان نے بنگال میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا' مگر اس نے جبر و تشدد اور خود پسندی کا ایسا مظاہرہ کیا کہ خلجی امراء نے عاجز آ کر اسے قتل کر دیا (1211ء)۔ حسام الدین خلجی سلطان غیاث الدین کے لقب سے بادشاہ بن گیا۔ اس کے زمانے میں بنگال نے بڑی ترقی کی۔ حدودِ سلطنت میں توسیع ہوئی۔ اڑیسہ' کامروپ اور وکرم پور کے ہندو راجا خراج دینے لگے اور دارالحکومت دیوکوٹ سے گور (لکھنوتی) منتقل ہو گیا۔ 1219ء میں اس نے جہازوں کا ایک بیڑا بنایا۔ 1225ء میں سلطان التتمش بہار و بنگال پر حملہ آور ہوا تو غیاث الدین نے التتمش کی اطاعت قبول کر لی' لیکن اس کے واپس ہوتے ہی بہار کے صوبیدار علاء الدین جانی کو مار بھگایا۔ اس پر التتمش کے فرزند ناصر الدین نے لکھنوتی پر چڑھائی کی۔ غیاث الدین گرفتار ہوا اور مارا گیا۔ اس طرح بنگال کی پہلی آزاد بادشاہت کا خاتمہ ہو گیا (1227ء)۔

بنگال 1227ء سے 1287ء تک سلطنت دہلی کا ایک حصہ رہا اور اس دوران میں یہاں یکے بعد دیگرے متعدد صوبیدار مقرر ہوئے جو بوجوہ کم و بیش خود مختار رہے۔ غیاث الدین بلبن کے عہدِ حکومت (1265 تا 1287ء) میں یہاں کا صوبیدار اس کا معتمد غلام مغیث الدین طغرل تھا۔ 1279ء میں بادشاہ ایسا بیمار ہوا کہ بعض علاقوں میں اس کی وفات کی افواہ پھیل گئی۔ طغرل نے ان دنوں بہار اور اڑیسہ میں بہت سی فتوحات حاصل کی تھیں۔ اس نے مال غنیمت کا پانچواں حصہ شاہی دربار میں بھیجنے کی بجائے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور یکے بعد دیگرے دو شاہی لشکروں کو' جو اسے سزا دینے کے لئے بھیجے گئے تھے' شکست دی۔ اب سلطان غیاث الدین بلبن خود بنگال پر حملہ آور ہوا (1280ء)۔ یہ سن کر طغرل فرار ہو گیا اور بنگال شاہی قبضے میں آ گیا۔ طغرل کا پیچھا کیا گیا اور بالآخر وہ مارا گیا۔ بلبن نے اپنے بیٹے بغرا خان کو بنگال کا حاکم بنایا اور دہلی واپس چلا گیا۔ بغرا خان کے وقت سے بنگال کی صوبیداری موروثی ہو گئی۔ یہ بلبنی حکمران سلطنتِ دہلی کی سیادت کو تسلیم تو کرتے تھے' لیکن اپنے صوبے کے معاملات میں وہ تقریباً آزاد و خود مختار تھے۔

1287ء میں خاندان غلاماں کے ہاتھ سے دہلی کی سلطنت جاتی رہی اور 1290ء میں خلجیوں اور پھر 1320ء میں تغلقوں کا اس پر قبضہ ہوا۔ محمد تغلق کے آخری زمانہ حکومت میں والیانِ بنگال علانیہ منحرف ہو گئے اور فیروز تغلق کو ان کی آزادی ماننا پڑی۔

آزاد مسلمان بادشاہوں کے زمانے میں بنگال نے بڑی آسودگی اور خوشحالی پائی۔ ملک کے گوشے گوشے میں سرکاری عمارات' قلعے' مسجدیں' مدرسے' اقامت خانے' سرائیں اور خانقاہیں تعمیر ہوئیں۔ تالاب کھودے گئے اور سڑکیں تیار ہوئیں۔ اس عہد میں دو شاہی خاندان حکمران رہے۔ ایک حاجی الیاس کا اور دوسرا علاء الدین حسین کا۔ درمیان میں راجا کنس اور اس کے جانشینوں نے کچھ عرصے کے لئے حکومت غصب کر لی۔ مملکتِ بنگالہ کو مسلمانوں نے اتنی وسعت دی کہ مغربی آسام (کامروپ)' کوچ بہار اور جاج نگر (اڑیسہ) کے علاقے اور شمالی و جنوبی بہار کا علاقہ پٹنہ تک ان کے زیرِ حکومت رہا۔ مسلم فوجوں نے دریائے میگھنا عبور کیا جو پہلے ان کی پیش قدمی میں سدِّ سکندری بنتا رہا تھا اور سلہٹ' نواکھلی اور چاٹگاؤں تک مسلط ہو گئیں۔ اس مملکت کے بڑے اور مرکزی شہر تین تھے:

(۱) غوریا گور' جو لکھنوتی کا نیا نام تھا اور وسط بنگال میں گنگا کے کنارے بہت عرصہ تک دارالحکومت رہا۔ اس شہر کے قریب پنڈوہ اور اکدالہ کے شاندار قلعے تعمیر ہوئے۔

(۲) مشرقی بنگال میں سنارگاؤں' موجودہ ڈھاکا کے قریب ایک وسیع شہر تھا۔ جب ڈھاکا آباد ہوا تو یہ اجڑ گیا۔

(۳) ساتگاؤں' دریائے ہگلی پر تجارتی اور انتظامی مرکز تھا۔ جب ندّی کے اٹ جانے سے آمد و رفت مشکل ہو گئی تو اس کی جگہ ہگلی بندر نے لے لی۔

1339ء میں بہرام کے قتل کے بعد اس کے مشیر فخر الدین نے بغاوت کی اور سلطان فخر الدین مبارک شاہ کے نام سے خطبہ پڑھا اور 1349ء تک حکومت کی۔ اس کے بعد مشرقی بنگال تین سال مزید خودمختار رہا اور اس کے لڑکے اختیار الدین غازی شاہ نے حکومت کی۔ 1353ء میں سنارگاؤں مغربی بنگال کی الیاس شاہی سلطنت کا حصہ ہو گیا۔

الیاس شاہی سلطنت

1342ء میں حاجی الیاس مغربی بنگال کے حاکم علی مبارک کو قتل کر کے تخت پر قابض ہوا اور سلطان شمس الدین کا لقب اختیار کیا۔ اس نے 1358ء تک حکومت کی' لیکن اس کے سکّے صرف 1357ء تک کے پائے جاتے ہیں۔ اُس کے زمانے میں علم کا چرچا ہوا اور عالموں کی قدر کی گئی۔ اخی سراج الدین المعروف بہ ''آئینہ ہند'' اور شیخ بیابانی مشہور صوفیہ اسی کے دربار سے وابستہ تھے۔

الیاس شاہ کی وفات کے بعد اس کا بیٹا سکندر شاہ اوّل (1358ء تا 1389ء) تخت نشین

ہوا۔ اس کے عہد میں بھی فیروز تغلق نے حملہ کیا' لیکن جلد ہی صلح ہوگئی اور وہ دہلی واپس چلا گیا۔ 30 سال کی مسلسل حکومت کے دوران سکندر شاہ نے بہت سی عمارات تعمیر کروائیں۔ 1388ء میں اس کے بیٹے غیاث الدین نے بغاوت کر دی۔ باپ بیٹے کے درمیان جنگ ہوئی۔ سکندر شاہ مارا گیا اور غیاث الدین 1389ء میں تخت پر بیٹھا۔ یہی وہ غیاث الدین اعظم شاہ (1389-1396ء) ہے جس نے ایران کے شاعر حافظ شیرازی سے خط و کتابت کی اور جون پور کے حاکم خواجہ جہاں اور چین کے شہنشاہ سے دوستی پیدا کی۔ ایک چینی سیاح ماھوان اُسی کے زمانے میں بنگالہ آیا اور اس نے یہاں کی تمدنی و معاشرتی حالت قلم بند کی۔

الیاس شاہی خاندان کے آخری سلاطین کی کمزوری کے باعث درباری بہت خودسر ہو گئے۔ امیروں میں سے ایک راجہ کنس بھی تھا' جس نے غیاث الدین اعظم کے پوتے شمس الدین ثانی کو 1409ء میں قتل کرا کے بایزید کو برائے نام تخت پر بٹھایا اور خود حکومت کی باگ ڈور سنبھال لی' لیکن کچھ عرصے بعد امراء کی مخالفت کی تاب نہ لا کر سلطنت اپنے بیٹے جدو کے حوالے کر دی۔ جدو نے حکمران بننے کے بعد اسلام قبول کر لیا اور جلال الدین محمد شاہ کے نام سے موسوم ہوا۔ اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا شمس الدین احمد شاہ تخت پر بیٹھا۔ 1442ء میں اسے قتل کر دیا گیا اور حکومت ایک بار پھر الیاس شاہیوں کے ہاتھ میں آ گئی۔

جس طرح عباسیوں کے زمانے میں ترکوں کی سرپرستی ہوئی تھی' اسی طرح بنگال کے آخری الیاس شاہی سلطانوں نے حبشیوں کی سرپرستی کی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جن امیروں کی وجہ سے سلطنت چلتی تھی' ان کا زور کم ہو گیا اور سلطنت کو نقصان پہنچا۔ محمود کے بیٹے جلال الدین فتح شاہ (1481-1486ء) نے حبشیوں کی قوت توڑنا چاہی تو ہنگامہ برپا ہو گیا' جس میں فتح شاہ کام آیا اور الیاس شاہی حکومت ختم ہوگئی۔ اس خاندان کے عہد میں بنگالہ کو معاشرتی اور معاشی ترقی نصیب ہوئی اور اس کے سلاطین بنگالی نہ ہونے کے باوجود اہل بنگال میں ہر دلعزیز رہے۔

حبشی سلطنت (1486-1492ء)

1486ء میں باربک خواجہ سرا حبشیوں کی سازش سے فتح شاہ کو قتل کر کے تخت پر بیٹھا' لیکن چند ماہ بعد ایک خیر خواہ حبشی سردار ملک اندیل کے ہاتھوں مارا گیا۔ ملک اندیل وزیر خان جہاں اور فتح شاہ کی بیوی کی رضامندی سے تخت پر بیٹھا اور سیف الدین کا لقب اختیار کیا۔ قلعہ گور کے قریب ''فیروز مینار'' بنا کر جشن منایا اور انعام تقسیم کیا۔ وہ لائق حکمران تھا' لیکن تین سال بعد وہ بھی مارا گیا۔ اب فتح شاہ کے نابالغ لڑکے ناصر الدین محمود کو تخت پر بٹھایا گیا' لیکن 1490ء میں وہ بھی موت کے گھاٹ اتر گیا اور شمس الدین مظفر کے لقب سے سیدی بدر تخت نشین ہوا۔ اس نے فوج کی تنخواہ کم کر دی' جس کی

وجہ سے بلوہ ہو گیا۔ اس کے وزیر سید حسین کی سرکردگی میں محل کا محاصرہ کر لیا گیا۔ مظفر مارا گیا اور حبشی حکومت کا خاتمہ ہوا۔ یہ بنگال کی تاریخ کا تاریک دور ہے' جس میں فوجی طاقت کمزور اور ملک کی معاشی' تہذیبی اور معاشرتی حالت ابتر ہوئی۔

حسین شاہی سلطنت (1493-1537ء)

چونکہ الیاس شاہی خاندان کا کوئی وارث باقی نہ رہا تھا' لہٰذا سید حسین نے علاء الدین حسین شاہ کا لقب اختیار کر کے تخت سنبھالا۔ 1495ء میں اس نے اپنے ''خلیفۃ اللہ'' ہونے کا اعلان کیا۔ حبشی امیروں کو برطرف کیا اور ان کے بدلے پرانے مسلم اور ہندو امراء کو بحال کیا۔ دارالحکومت گور سے ایکڈالا منتقل کیا۔ وہ خود عرب تھا' لیکن اس نے بنگالیوں کی زبان اور تہذیب کی سرپرستی کی اور فتوحات اور تعمیرات کے دور کا آغاز ہوا۔

حسین شاہ سے مسلمان اور ہندو دونوں خوش تھے۔ فیروز آباد میں اُس نے قطب عالم کے مقبرے کے لئے خاصی جاگیر مقرر کی۔ اُس نے متعدد دینی مدارس قائم کئے۔ ہندو اسے کرشن کا اوتار کہتے تھے' چنانچہ بہت سے ہندو مصنفین اور شعراء نے اسے ''نیک نام'' سے یاد کیا ہے۔

1519ء میں حسین شاہ کی وفات کے بعد اس کا بڑا بیٹا ناصر الدین ابوالمظفر ''نصرت شاہ'' کے نام سے تخت نشین ہوا۔ اس کے عہد میں رامائن اور مہابھارت کا بنگلہ زبان میں ترجمہ ہوا اور سونا مسجد اور قدم رسول کی عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ اسی زمانے میں بابر نے ابراہیم لودھی کو شکست دے کر مغلیہ سلطنت کی بنیاد رکھی۔ چندیری کی لڑائی کے بعد بابر بادشاہ کو بہار میں افغان سرداروں کی یورش کا سامنا کرنا پڑا' جن کا سرغنہ نصرت کا برادرِ نسبتی محمود لودھی تھا۔ گھاگھرا اور گنگا کے سنگم پر لڑائی ہوئی۔ میدان بابر کے ہاتھ رہا اور نصرت کو اطاعت اور سالانہ خراج ادا کرنے کا اقرار کرنا پڑا۔

1532ء میں نصرت شاہ کو اس کے ایک غلام نے قتل کر دیا تو اس کا بیٹا علاء الدین فیروز شاہ تخت پر بیٹھا' لیکن چند ہی روز بعد نصرت کے چھوٹے بھائی غیاث الدین محمود نے اسے ہلاک کر کے حکومت پر قبضہ کر لیا۔ اس کے عہد میں شیر شاہ سوری نے بنگال پر حملہ کیا۔ ان دنوں ہمایوں مغربی ہند کی شورشیں فرو کرنے میں مصروف تھا اور شیر شاہ سوری نے موقع سے فائدہ اٹھا کر بہار میں اپنی قوت مستحکم کر لی تھی۔ درّہ تلیا گڑھی میں محمود نے اس کا مقابلہ کیا' لیکن پسپا ہو کر گور کی طرف ہٹ آیا اور ہمایوں سے مدد طلب کی۔ اس سے قبل کہ ہمایوں اس کی مدد کو پہنچتا' افغان لشکر نے گور پر قبضہ کر لیا۔ محمود فرار ہو کر زخمی حالت میں ہمایوں کے لشکر میں پہنچا جو اس وقت دریائے سون اور گنگا کے سنگم پر اترا ہوا تھا۔ افغانوں کو کچلنے کے لئے شاہی لشکر آگے بڑھا تو کہل گاؤں میں شیر شاہ سوری کے بیٹے جلال خان سوری نے اس کا راستہ روکا' تا آنکہ شیر شاہ سوری اپنے خزانے سمیت بحفاظت جنوبی بہار میں پہنچ گیا۔ اسی

دوران میں محمود کو اپنے دو بیٹوں کی ہلاکت کی خبر ملی' جو اُس کے لئے جان لیوا ثابت ہوئی (1537ء)۔اس کے مرنے کے ساتھ ہی بنگال کی اس خودمختار مسلم بادشاہت کا خاتمہ ہوگیا۔

افغانوں کی حکومت

1538ء میں ہمایوں کا گور پر قبضہ ہوگیا۔اس نے بنگال کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے کا اعلان کیا۔گور کا نام جنت آباد رکھا اور ہفتوں اپنی کامیابی کا جشن منایا۔تاہم اسے بنگال میں چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔آگرہ اور دوآب سے اطلاعات آ رہی تھیں کہ اس کے بھائی تخت شاہی پر قابض ہونے کی فکر میں ہیں۔چنانچہ وہ جہانگیر قلی بیگ کو بنگالے کا گورنر مقرر کر کے آگرہ کی طرف روانہ ہوا۔ دوسری طرف شیر شاہ سوری بہار سے قنوج تک تمام قلعوں میں اپنی فوجیں بٹھا چکا تھا۔چوسہ کے مقام پر ہمایوں نے شکست کھائی اور وہ بمشکل جان بچا کر دارالسلطنت پہنچ سکا (26 جون 1539ء)۔اب شیر شاہ سوری نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر کے بنگال کا رخ کیا۔جہانگیر قلی بیگ میدانِ جنگ میں مارا گیا اور گور پر افغانوں کا قبضہ ہوگیا۔

شیر شاہ سوری نے خضر خان ترک کو بنگال کا گورنر مقرر کیا تھا' لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ وہ سابق شاہ بنگالہ محمود کی بیٹی سے شادی کر کے خودمختاری کے خواب دیکھ رہا ہے تو اسے گرفتار کر کے شیر شاہ نے ملک کا نظم ونسق مختلف شعبوں میں تقسیم کر دیا اور قاضی فضیلت کو سربراہ مقرر کیا۔

شیر شاہ سوری کے بیٹے اسلام شاہ سوری کے عہد میں محمد خان بنگال کا گورنر تھا۔اسلام شاہ کی وفات (22 نومبر 1554ء) کے بعد اس نے بنگال میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور اپنا لقب ''شمس الدین محمد شاہ غازی'' اختیار کیا۔اس نے ایک طرف اراکان پر حملہ کیا اور دوسری طرف جون پور پر قبضہ کیا۔وہ ہیمو بقال کے ہاتھ سے مارا گیا۔اس کے بیٹے خضر خان غیاث الدین نے 1560ء تک حکومت کی۔اس کے مرنے کے بعد سوریوں میں خانہ جنگی ہوئی اور 1563ء میں کررانی افغان بنگال میں برسراقتدار آئے' جن کا سربراہ سلیمان خان تھا۔

سلیمان خان نے مغربی بنگال اور جنوب مشرقی بہار پر قبضہ کر لیا اور کوچ بہار سے اڑیسہ اور دریائے سون سے برہم پتر تک اپنی سلطنت کی توسیع کر لی۔اگرچہ سلیمان خان نے اپنی بادشاہت کا اعلان نہیں کیا' تاہم اس نے ایک بادشاہ کی طرح آٹھ سال تک حکومت کی اور اکبر بادشاہ کے نام کا خطبہ پڑھ کر اپنا اقتدار برقرار رکھا۔11/اکتوبر 1572ء کو سلیمان خان کررانی نے وفات پائی۔اس کا لڑکا بایزید تخت سے اتارا گیا اور اس کا چھوٹا بھائی داؤد خان تخت پر بیٹھا۔داؤد نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا' لیکن وہ اکبر کے تجربہ کار سپہ سالار منعم خان کے سامنے نہ ٹھہر سکا اور پٹنہ میں قلعہ بند ہوگیا' جہاں خود اکبر کے زیرنگرانی سخت معرکہ ہوا (1575ء)۔داؤد خان نے شکست کھائی اور بنگال پر

مغلوں کا قبضہ ہو گیا۔

مغلوں کی حکومت

اکبر مشرقی علاقے منعم خان کے حوالے کر کے واپس چلا گیا' لیکن منعم خان جلد ہی وفات پا گیا۔ اس کے جانشین حسین قلی بیگ کے دورِ نظامت میں داؤد خان نے پھر حکومت حاصل کرنے کی کوشش کی اور میدانِ جنگ میں مارا گیا۔ افغان اکبر کے دورِ حکومت میں بنگال' بہار اور اڑیسہ میں اپنی کھوئی ہوئی حکومت حاصل کرنے کی کوششوں میں برابر مصروف رہے۔ جہانگیر کے عہد میں پہلے مان سنگھ اور پھر اسلام خان بنگال کا ناظم مقرر ہوا۔ اسلام خان کے زمانے میں جدید بنگال کی نشوونما ہوئی اور بحری تجارت کو فروغ ہوا۔ پرانے بیرونی تاجروں (چینی' ملائی' عرب اور پرتگیزیوں) کی جگہ ولندیزیوں' فرانسیسیوں اور انگریزوں نے اپنی اپنی کمپنیاں قائم کیں اور درآمدی تجارت کو منظم کیا۔

اسلام خان کی وفات کے بعد بیس سال کے عرصے میں یہاں یکے بعد دیگرے متعدد گورنر آئے' لیکن ناکام ثابت ہوئے۔ جہانگیر کے خلاف جب شاہجہاں نے بغاوت کی تو وہ دکن سے اڑیسہ ہوتا ہوا مدناپور آیا اور بردوان پر قبضہ کر لیا۔ بنگال کا گورنر نور جہاں کا بھائی ابراہیم خان تھا جو 1624ء میں لڑتا ہوا مارا گیا اور جہانگیر نگر شاہجہاں کے ہاتھ آیا۔ اس نے خان خاناں کے لڑکے داراب خان کو بنگال کا گورنر بنایا۔ 1624ء میں شاہجہاں نے جہانگیر کی شاہی فوج سے شکست کھائی اور پھر دکن میں جا پناہ لی۔ بنگال کا گورنر مہابت مقرر ہوا اور داراب خان مارا گیا' لیکن نور جہاں کی سازش کی وجہ سے مہابت خان نے بغاوت کر دی اور جون 1626ء میں شاہجہاں سے مل گیا۔

اب جہانگیر نے فدائی خان کو بنگال کا گورنر مقرر کیا' جس نے پانچ لاکھ روپیہ سالانہ جہانگیر کو اور اتنی ہی رقم نور جہاں کو بھیجنا شروع کی۔ جہانگیر کے زمانے میں بنگال میں سیاسی اور جغرافیائی اتحاد اور اس کا مرکزی سلطنت (دہلی) کے ساتھ براہ راست تعلق پیدا ہوا۔ شاہجہاں اور اورنگ زیب کے عہد میں 80 سال تک بنگال میں امن وامان قائم رہا اور آسام اور اڑیسہ کی طرف بنگال کی سرحد بڑھی۔ اراکان میں آباد پرتگیز' جو ہگلی پر بھی قابض ہو چکے تھے' بحری قزاقی اور لوٹ مار کرنے کے علاوہ اکثر مغلوں کے خلاف اراکان کے مگھ راجاؤں کی مدد کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ ان کی سرگرمیوں سے تجارت اور استحکامِ سلطنت کو بہت نقصان پہنچ رہا تھا۔

شاہزادہ شجاع نے بنگال پر 21 سال (1639-1660ء) حکومت کی۔ اس کے عہد میں ولندیزیوں اور انگریزوں کو تجارت کی اجازت ملی۔ شاہجہاں کی علالت کے وقت دہلی کی سلطنت کے لئے جو خانہ جنگی ہوئی' اس میں شجاع کو پرتگیزیوں نے مدد دی۔ تاہم اورنگزیب کا سپہ سالار میر جملہ ڈھاکے میں داخل ہوا اور بنگال پر اورنگزیب کا قبضہ ہو گیا۔ میر جملہ کو بنگال کا گورنر بنایا گیا۔ اس کے

بعد شائستہ خان بادشاہ کا نائب مقرر ہوا۔ اس کے طویل دور میں سینکڑوں مدرسے' مسجدیں' پل' سڑکیں اور سرائیں تعمیر ہوئیں۔ مغل تہذیب کا فروغ ہوا اور حسنِ انتظام کے باعث ملک میں خوشحالی اور ارزانی ہوگئی۔ 1666ء میں چاٹگاؤں پر قبضہ ہوا اور اس کا نام اسلام آباد رکھا گیا۔

اورنگزیب عالمگیر کے آخری زمانے میں اس کا پوتا عظیم الشان بنگال کا صوبیدار تھا۔ دسمبر 1700ء میں مرشد قلی خان یہاں کا دیوان ہو کر آیا۔ اس نے انتظام درست کرنے کے ساتھ ملکی آمدنی میں اضافہ بھی کیا۔ 1704ء میں اس نے ڈھاکا سے ڈیڑھ سو میل مشرق میں مقصود آباد کو اپنا مستقر بنایا جو اس کے نام سے ''مرشد آباد'' کہلانے لگا اور اس کے صوبیدار ہونے پر بنگال کا دارالحکومت ہوگیا۔

مرشد قلی خان ایک کامیاب گورنر ثابت ہوا۔ اس نے محصول کی ادائی کم کر دی۔ اندرونی امن قائم رکھنے کے لئے جو فوج تھی' اس کی تعداد گھٹا دی۔ حکام کی جاگیروں کو خالصہ زمین قرار دے کر ان کے عوض ان کی تنخواہ مقرر کی۔ زمینداروں سے لگان الگ الگ اکٹھا کرنے کے بجائے اجارہ داری کا دستور قائم کیا' جس کی رو سے ٹھیکیدار ایک مقررہ رقم پیشگی ادا کر دیتے تھے۔ بیرونی تجارت کو فروغ دیا۔ فرنگی تاجروں پر کڑی نگرانی رکھی اور رشوت ستانی اور ریشہ دوانی کے راستے بند کئے۔ اس کے عہد کی خوشحالی کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ چند سال بعد لارڈ کلایو نے مرشد آباد کے بارے میں لکھا کہ یہ شہر لندن کے برابر وسیع ہے' لیکن لندن میں اتنے لکھ پتی نہیں جتنے مرشد آباد میں ہیں۔ کتابوں میں مرشد قلی خان کے عہد کی خیر و برکت کے کئی قصے ملتے ہیں۔ ان دنوں ایک روپے میں پانچ من چاول مل جاتا تھا۔ 30 جون 1727ء کو مرشد قلی خان نے وفات پائی اور اس کا داماد شجاع الدولہ بنگال کا صوبیدار مقرر ہوا۔

بنگال کے نیم آزاد صوبیدار

اس زمانے میں بنگال اور بہار نے بادشاہ دہلی سے علانیہ سرکشی نہیں کی' لیکن محمد شاہ کے دور میں مرکزی حکومت اتنی کمزور ہوگئی کہ اس کا اقتدار بنگال اور دکن جیسے بڑے صوبوں پر قائم نہ رہا' اور صوبیداری میں وراثت کا اصول چلنے لگا' لہٰذا اس زمانے سے بنگال کو نیم آزاد سمجھنا غلط نہ ہوگا۔

۞ **شجاع الدولہ** (1727-1739ء): یہ ایک دانا' عاقل اور رعایا پرور حاکم تھا۔ اس نے اپنی فوج کی طاقت پچاس ہزار تک بڑھالی۔ اشیاء کی قیمتیں مزید ارزاں ہوگئیں۔ ایک روپے میں آٹھ من چاول ملنے لگا۔ اس نے پورے صوبہ بنگال کو انتظامی لحاظ سے تین حصوں یعنی ڈھاکا' اڑیسہ اور بہار میں تقسیم کیا۔ ڈھاکہ میں مرشد قلی خان دوم کو' بہار میں علی وردی خان کو اور اڑیسہ میں محمد تقی خان کو نائب ناظم مقرر کیا۔ 13 مارچ 1739ء کو شجاع الدولہ نے وفات پائی اور اس کا بیٹا سرفراز بنگال کی مسند پر

بیٹھا' لیکن علی وردی خان سے مات کھا گیا۔ ایک طرف تو سرفراز کے مشیروں نے علی وردی کو بنگال پر حملہ کرنے کی دعوت دی اور دوسری طرف علی وردی نے بادشاہ دہلی سے گراں بہا پیشکش کے معاوضے میں بنگال کی مسندِ نظامت حاصل کر لی۔ جنگ ہوئی۔ سرفراز نے شکست کھائی۔ علی وردی خان نے مرشد آباد کے چہل ستون محل میں مسند نشین ہوتے ہی اپنی آزادی کا اعلان کیا اور اڑیسہ کے نائب ناظم محمد تقی خان کو دکن مار بھگایا۔

۞ **علی وردی خان** (1740-1757ء): اڑیسہ پر قبضہ کرنے کی وجہ سے علی وردی خان کو مرہٹوں سے ٹکر لینی پڑی جو گیارہ سال تک حملے کرتے رہے۔ اس کے ساتھ ہی علی وردی خان کو اپنے پٹھان سپاہیوں کی شورش کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ پٹھان سردار مرہٹہ غارت گروں کو دعوت دیتے اور ان سے مل کر جگہ جگہ فتنے و فساد کھڑا کرتے رہے' لیکن وہ علی وردی خان کا کچھ زیادہ نہ بگاڑ سکے۔ یہ تجربہ کار حاکم فرنگی تاجروں کی طرف سے بھی بہت چوکنا رہتا تھا اور بنگال میں انہیں تجارتی کوٹھیوں کے گرد فصیل اور دمدمے نہیں بنانے دیتا تھا۔ اپریل 1757ء میں اس نے وفات پائی اور اس کا نواسا سراج الدولہ مسند نشین ہوا۔

۞ **سراج الدولہ** (اپریل 1756-22 جون 1757ء): اسے روز اوّل سے اپنے جاہ طلب رشتہ داروں اور امیروں وزیروں کا مقابلہ کرنا پڑا' جن میں اس کا چچازاد بھائی شوکت جنگ اور اس کا سوتیلا پھوپھا میر جعفر بالخصوص قابل ذکر ہیں۔ ان مخالفین کے ساتھ انگریز بھی جوڑ توڑ میں لگے ہوئے تھے۔ سراج الدولہ نے بڑی ہمت اور جرأت کا ثبوت دیا۔ اس نے گھسیٹی بیگم کے موتی جھیل محل پر قبضہ کیا۔ پھر انگریزوں کی طرف پلٹ کر پہلے قاسم بازار اور پھر کلکتہ میں فاتحانہ داخل ہوا (جون 1756ء)۔ میر جعفر شوکت جنگ کو برسر اقتدار لانا چاہتا تھا' تاکہ ایک کمزور اور نااہل شخص کو تخت پر بٹھا کر زمامِ حکومت خود سنبھال لے' لیکن سراج الدولہ نے شوکت جنگ کی راجدھانی پورنیا پر فوج کشی کر کے یہ سازش ناکام بنا دی اور شوکت جنگ میدان میں کام آیا (اکتوبر 1756ء)۔ اس کے بعد سراج الدولہ نے کلکتہ پر حملہ کر کے انگریزوں کو نکال باہر کیا (فروری 1757ء)۔ انگریزوں نے اپنی شکست کا داغ دھونے کے لئے بااثر ہندو سیٹھوں اور ہندو اہلکاروں اور میر جعفر جیسے غدار مسلمانوں کو ساتھ ملا کر سراج الدولہ کی حکومت کا تختہ الٹنے کا منصوبہ بنایا۔ 22/جون 1757ء کو پلاسی میں انگریزی فوجیں صف آراء ہوئیں اور اگلے روز میر جعفر اور اس کے ساتھیوں کی غداری کے باعث میدان انگریزوں کے ہاتھ رہا۔ سراج الدولہ پلاسی سے مرشد آباد اور وہاں سے عظیم آباد کی طرف روانہ ہوا' لیکن راستے میں گرفتار ہو کر مرشد آباد لایا گیا' جہاں میر جعفر کے بیٹے میرن کے حکم سے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور میر جعفر کو نواب بنا دیا گیا۔

۞ **میر جعفر** (29 جون 1757ء-1760ء): اس کی حکومت کا دارومدار سراسر انگریزوں کی

خوشنودی پر تھا۔ اس نے انہیں فرانسیسی مقبوضات پر قبضہ کر لینے کی اجازت دے دی۔ اس کے علاوہ سراج الدولہ کے حملے کی وجہ سے انگریزوں کو جو نقصان ہوا تھا' اس کے بدلے میں ایک کروڑ 22 لاکھ روپیہ اور چوبیس پرگنہ کا ضلع ایسٹ انڈیا کمپنی کو اور سوا کروڑ روپیہ کمپنی کے ملازمین کو ادا کرنا پڑا۔ اس میں سے صرف کلایو کا حصہ 23 لاکھ 40 ہزار روپیہ تھا۔ چونکہ خزانے میں اس کا صرف آدھا روپیہ تھا' لہٰذا باقی رقم سامان بیچ کر اور سیٹھوں سے قرضہ لے کر دینی پڑی۔ الغرض میر جعفر نے کمپنی کی طمع ہر طرح پوری کرنے کی کوشش کی۔ ''کلایو کا گدھا'' کہلایا' لیکن جب ڈیڑھ دو سال بعد انگریزوں کو شہزادہ علی گوہر اور مرہٹوں کا مقابلہ کرنے کے لئے مزید رقم کی ضرورت ہوئی اور میر جعفر ان کی توقع پوری نہ کر سکا تو انہوں نے اسے معزول کر کے اس کے داماد میر قاسم کو اس کی جگہ بٹھا دیا (1760ء)' جس نے ان کے اخراجات کے لئے بردوان' مدنا پور اور چاٹگاؤں کے پرگنے ان کے سپرد کئے۔

۞ میر قاسم (1760ء۔1763): وہ ایک قابل حکمران تھا۔ وہ ملک میں امن و امان اور نظم و نسق کی بحالی کا خواہاں تھا اور اس میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہوا' لیکن انگریز اپنے آپ کو ہر قاعدے قانون سے ماورا سمجھتے تھے۔ کمپنی کا ہر ملازم اپنے مال کو محصول سے مستثنیٰ سمجھتا تھا۔ اس سے ملک اور مقامی تاجروں کی مالی حالت روز بروز گرتی جا رہی تھی۔ میر قاسم حتی الامکان لڑائی سے بچنا چاہتا تھا' اسی لئے اس نے مرشد آباد چھوڑ کر مونگیر کو اپنا مستقر بنا لیا۔ آخر اس نے انگریزوں کو محصول معاف کر دیا' لیکن اس کے ساتھ ہی یہ رعایت مقامی تاجروں کو بھی دے دی۔ یہ اقدام انگریزوں کی اجارہ داری کے حق میں مہلک تھا۔ چنانچہ انہوں نے لڑائی چھیڑ دی اور دوبارہ میر جعفر کی نوابی کا اعلان کر دیا (1763ء)۔ میر قاسم بہار سے ہوتا ہوا اودھ پہنچا' جہاں شاہ عالم اور نواب شجاع الدولہ اس کی اعانت پر آمادہ ہو گئے' لیکن شجاع الدولہ نے بے وفائی کی' میر قاسم کو نظر بند کر دیا اور اس کی فوج اور بادشاہ کو لے کر انگریزوں سے لڑنے چلا۔ بکسر کے مقام پر انگریزوں نے اسے شکست دی (1764ء)۔ شاہ عالم انگریزی لشکر میں آ گیا اور بنگال کے تینوں صوبوں کی سند دیوانی ان کے نام لکھ دی۔ جنوری 1765ء میں میر جعفر کی موت کے بعد اس کا بیٹا نجم الدولہ گدی پر بیٹھا' لیکن وہ انگریزوں کا محض وظیفہ خوار تھا' جس کا حکومت میں کوئی عمل دخل نہ تھا۔ بنگال پر انگریزوں کا قبضہ مکمل ہو گیا۔ (جاری ہے)